APRIL
2026

گلہائے
رنگ رنگ
رانا محمد شاہد

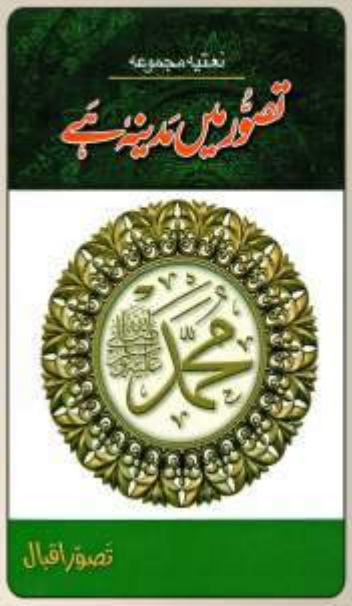
نعتیہ مجموعہ
تصویر میں مدینہ ہے
تصور اقبال

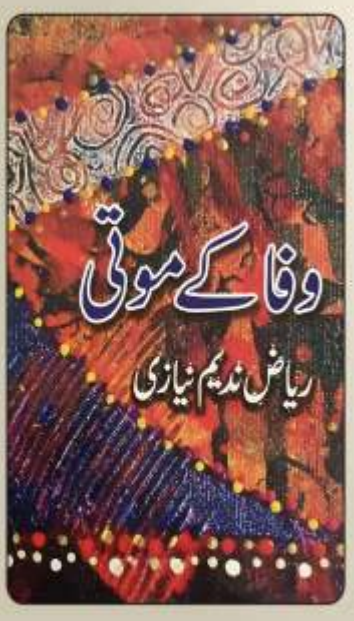
وفا کے موتی
ریاض ندیم نیازی

دوسری ماچس
راشد امین

رجز

زر گل ہوئی مری گرد بھی کہ ریاض عشق رسول ہوں
بڑی پاک خاک ہے یہ گلی، میں اسی کی دھول کا پھول ہوں

وہ شہنشہء عرب و عجم ، وہ تہ فلک حرم امم
میں انہی کی تیغ نیام ہوں، میں انہی کی زرہ فضول ہوں

مرے بادشاہ ، مرے ولی ، مہ و مہر فاطمہ و علی
حسن و حسین مرے ولی کہ بلال بیت بتول ہوں

یہ گلی دیار علوم ہیں ، وہ مہ رسل کے نجوم ہیں
یہی مکہتیں مری روح ہیں، میں انہی کے نور کی دھول ہوں

مرا فن خطاؤں کی پوٹ ہے، مرے دل میں نام کا کھوٹ ہے
مری سمت آئی نہ لوٹ کر، میں نگاہ لطف کی بھول ہوں

مری آنکھ میری ندیم ہے ، مری نیند میری گھیم ہے
یہ عطائے رب کریم ہے کہ گدائے روئے رسول ہوں

پس نوم بھی درباز ہیں ، سر باب خواب دراز ہیں
مری پتلیوں کی ہتھیلیاں کہ فقیر باب قبول ہوں

مجھے عمر بھر ہے یہ دیکھنا ، مرا جسم ہے مرا آئینہ
یہ رضائے رب بہار ہے کہ میں سر بہ جیب، ببول ہوں

مری بے حسی مرے ساتھ ہے، مرے ہاتھ میں مرا ہاتھ ہے
نہ میں اپنے سکھ پہ نہال ہوں، نہ میں اپنے دکھ پہ ملول ہوں

مری گور تھل چراغ ہو ، کہ یہ گور خاک پہ داغ ہو
مجھے کیا خبر نہ قبول ہوں ، مجھے کیا خبر کہ قبول ہوں

زر گل ہوئی مری گرد بھی کہ ریاض عشق رسول ہوں
بڑی پاک خاک ہے یہ گلی، میں اسی کی دھول کا پھول ہوں

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 37083901-9
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5252311 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 34 - اپریل 2026 - شمارہ نمبر: 4

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: بیٹم عمران
کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:
قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور (ایڈیٹر، پبلشر) اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	محمد افضال انجم، سرور حسین نقشبندی	7 تا 8
2	نعت	محمد یسین قمر، اعجاز کنور راجہ، سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز رضا اللہ حیدر، محمد افضال انجم، افروز رضوی، نبیل احمد نبیل سرور حسین نقشبندی، علمدار حسین، صغیر احمد صغیر	9 تا 19
3	عقیدت	طالب انصاری، فیض رسول فیضان، مرزا آصف رسول صوفی محمد ضیا شاہد، غضنفر مہدی، عمود ابرار	20 تا 25
4	مناجات	محمد انیس انصاری	26
5	رباعیات	گلزار بخاری، سعید اشعر، محمد نصیر زندہ	27 تا 29
6	ہائیکو	محمد نوید مرزا	30
7	افسانے	سیما پیروز، ظہور احمد، ناز اوکاڑوی، رانا محمد شاہد، نور نجف محمد علی نجیب، نعمان منظور	31 تا 66
8	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، اعجاز کنور راجہ انور شعور، خاور اعجاز، گلزار بخاری، راحت سرحدی، قیوم طاہر طالب انصاری، شریف ساجد، محمد انیس انصاری	67 تا 143

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	اقبال سرویہ، نثار ترابی، طارق بٹ، عقیل رحمانی، خالدہ انور فیض رسول فیضان، محمد افضال انجم، شاہین عباس، افروز رضوی رضا اللہ حیدر، احمد جلیل، شوکت محمود شوکت، اکرم ناصر اجمل اعجاز، فیاض تحسین، تنویر قاضی، مسعود احمد، غافر شہزاد رخشندہ نوید، اعجاز دانش، آفتاب خان، سعدیہ بشیر، افتخار الحق شاہد اشرف، محمد دلشاد رانا، سمیع اللہ عرفی، اصغر علی بلوچ قمر بشیر، سلیم فگار، عابد خان عابد، راجا نیّر، انوار انجم آصف شفیع، نبیل احمد نبیل، شمشیر حیدر، قمر نیاز اکرم جاذب ظہور چوہان، ناصر علی ناصر، نبیل قیصر، محمد نوید مرزا، جمیل حیات وسیم جبران، نائلہ راٹھور، اسد رضا سحر، محمد اشفاق بیگ میتھو محسن، سرفراز عارض، محمد علی ایاز، آفتاب عارض الماس شمی، اویس راجا، عاصم بخاری، ثمر جمال، مسکان گل جمشید کمبوہ، فیصل زمان چشتی، سیّد تیمور کاظمی، سجاد بلوچ انس فرید، نوید عاجز، رخسانہ سمن، میاں مزمل لطیف، عبدالرؤف زین	67 تا 143
9	مضامین	جلیل عالی، نسیم سحر، نثار ترابی، خاور اعجاز، غافر شہزاد جمیل احمد عدیل، حمید قیصر، شاہین عباس، افتخار بخاری ریاض ندیم نیازی، انصر منیر، تنویر قاضی، محمد افتخار شفیع، سعید اشعر محمد علی نجیب، محمد ندیم صادق، محمد عثمان جامعی عباس علی شاہ ثاقب، محمد علی راحیل خان، رانا خالد محمود قیصر	144 تا 214
10	طنز و مزاح خاکہ	عمار نعیمی	215 تا 217
11	نظمیں	خالد احمد، جلیل عالی، گلزار بخاری، سید افسر ساجد محمد انیس انصاری، طارق بٹ، احمد جلیل، رخشندہ نوید طلعت شبیر، تنویر قاضی، سمیع اللہ عرفی، ارشد محمود ارشد امجد بابر، منظر اعجاز، سرور حسین نقشبندی، شبیر آکاش، نائلہ راٹھور عاصم بخاری، جنید نسیم سیٹھی، محمد عبداللہ، نعمان منظور، اعجاز رضوی	218 تا 241

حمد

جس کی محکم ہے بات ہے مرا ربّ
سخت ہے جس کی گھات ہے مرا ربّ

موت بھی اس کے حکم کی پابند
سب کو دے جو حیات ہے مرا ربّ

جس کا کوئی نہیں شریک و سہیم
ایسی اک تنہا ذات ہے مرا ربّ

از ازل تا ابد وہ ہے قائم
وہ جسے ہے ثبات ہے مرا ربّ

خود کو تنہا کبھی نہیں پایا
ہر گھڑی میرے ساتھ ہے مرا ربّ

وہ ہی دے فصل گل خزاں کے بعد
لائے جو دن کہ رات ہے مرا ربّ

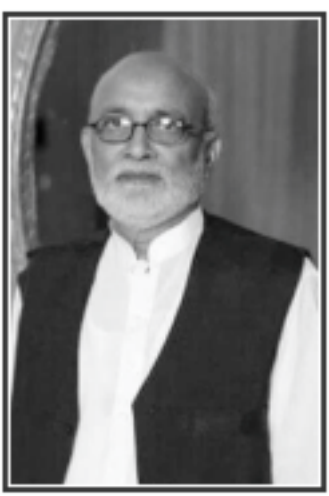

کس جگہ پر نہیں ہے وہ موجود
ہر طرف ہر جہات ہے مرا ربّ

اس کی تعریف کون کر پائے
حامل کل صفات ہے مرا ربّ

دکھ بھی آتے ہیں اس کی جانب سے
دے جو غم سے نجات ہے مرا ربّ

محمد افضال انجم

حمد

میرے کبریا میرے مالکا
میرے ملتجا میرے مالکا

تو نے ٹوٹنے نہ دیا کبھی
میرا حوصلہ میرے مالکا

تیرے ذکر و فکر میں ہو بسر
میرا رتجگا میرے مالکا

تو ہی اپنے ساتھ بحال رکھ
میرا رابطہ میرے مالکا

میں شکستگی کا لباس ہوں
میں ہوں خستہ پا میرے مالکا

تو ہے ہر کہیں تو ہے ہر طرف
تو ہے جابجا میرے مالکا

کرے کون پورا ترے سوا
میرا مدعا میرے مالکا

کوئی حل نہ تیرے سوا کرے
میرا مسئلہ میرے مالکا

مجھے اپنی سمت رواں رکھے
تیرا راستہ میرے مالکا

میری بندگی کو قبول کر
میرے مالکا میرے مالکا

کرے کیسے سرور بے نوا
تیرا سامنا میرے مالکا

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ [محترم خالد احمد کی زمین میں کہی گئی]

کوئی خاص ہی کرم ہے کوئی خاص ہی عطا ہے
کبھی سوچ میں احد ہے، کبھی فکر میں حرا ہے

شہِ دوسرا کی نسبت، درِ مصطفیٰؐ کی چاہت
مرے کرب کا مداوا مرے درد کی دوا ہے

اسی اسم پاک سے ہو مری تاحیات الفت
تو نے کُن کے ساتھ مولا سرِ عرش جو لکھا ہے

ہے یہ فیض سبز گنبد ہے یہ رنگِ حسنِ طیبہ
یہ افق افق اجالے یہ سماں جو نور کا ہے

دلِ مضطرب سنبھل جا یہ مقام ہے ادب کا
یہ ہے سرزمینِ بطحا یہاں خامشی صدا ہے

ہو لحد مری بھی روشن ہو بقیع پاک مدفن
مری صبح و شام رب سے یہی ایک التجا ہے

مجھے بخش دے خدایا اسی خوش ادا کی صحبت
وہ جو حمد آشنا ہو ، وہ جو خوگرِ ثنا ہے

یہ قمر ہے ان کی رحمت، یہ عنایتیں ہیں ان کی
یہ جو کیف قلب و جاں ہے، یہ جو اک سرور سا ہے

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

بھر گیا پل میں دستِ دعا، خواہشوں سے سوا لے لیا
آپ کے نام پر یا نبیؐ، لطفِ جود و سخا لے لیا

موج در موج لڑتے رہے، اِک یقیں کے بھروسے پہ ہم
جس نے ناؤ طلب کی ملی، جس نے کچا گھڑا لے لیا

پل میں یہ شہرِ حرص و ہوس شہرِ عشقِ نبیؐ بن گیا
دم مہکنے لگے دم بہ دم آپؐ کا نام کیا لے لیا

بند آنکھوں پہ کُھلنے لگیں منزلیں جو تصور میں تھیں
کلمۂ طیبہ پڑھ لیا جادۂ حق نما لے لیا

یہ مدینہ یہ شہرِ نبیؐ بن گیا رحمتوں کا نگر
پاؤں رکھا زمیں پر مگر جنّتوں کا مزا لے لیا

یاس کی رات ڈھلنے لگی آس کا دن نکلنے لگا
تجھ سے عشقِ نبیؐ کا صلہ یا سریع الرضا لے لیا

کالی کملی خیالوں میں تھی گرم صحراؤں کی ریت پر
قہر کے موسموں میں کنور لطفِ بادِ صبا لے لیا

اعجاز کنور راجہ

نعتؐ

برتر از وہم و گماں ذات آپؐ کی
باعث تسکین جاں ذات آپؐ کی

ہے معطر ہر گل و برگ و گیاہ
اک مہکتا گلستاں ذات آپؐ کی

رفعتیں، گہرائیاں، پہنائیاں
ایک بحر بے کراں ذات آپؐ کی

بندگی خالق کی رہ پر آگئی
منزل راحت نشاں ذات آپؐ کی

ذرے ہم دوش ثریا آپؐ سے
بے کسوں پر مہرباں ذات آپؐ کی

چلچلاتی دھوپ میں سایہ فگن
موجب حفظ و اماں ذات آپؐ کی

دین و دنیا کی حقیقت آپؐ ہیں
ہے رگ جاں رواں ذات آپؐ کی

مشرق و مغرب میں چرچا آپؐ کا
شش جہت میں جاوداں ذات آپؐ کی

منزل اخریٰ نظر میں آگئی
ہے جو میر کارواں ذات آپؐ کی

خالق و مخلوق میں قرب آپؐ سے
ایک پُل یہ درمیاں ذات آپؐ کی

گل فشاں ہیں آپؐ سے سب عرش و فرش
ہے ریاض لامکاں ذات آپؐ کی

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

وہ نورِ حق جو عیاں آپؐ کے حضور ہُوا
کِرن کِرن وہی انسان کا شعور ہُوا

دمک اُٹھا پسِ پردہ ابد کا چہرا بھی
ازل کی اوٹ سے جب آپؐ کا ظہور ہُوا

چراغِ عالمِ امکاں کی لو جل اُٹھی تھی
محیطِ کون و مکاں تھا کہ مثلِ نُور ہُوا

جو لہر چھو گئی اُنؐ کو حریفِ بحر ہُوئی
جو ذرّہ پاؤں سے لپٹا وہ رشکِ طور ہُوا

انہوںؐ نے بات جو کی وقت کی حدیث ہُوئی
جو اُنؐ پہ اُترا وہ قرآن کی سطور ہُوا

چھپا تھا سینۂ افلاک میں جو حرفِ شوق
لبوں سے اُنؐ کے ادا ہو کے موجِ نُور ہُوا

جہانِ معنٰی سے اُنؐ کے ہمیں بھی نسبت ہے
طفیل اُنؐ کے ہمیں حرف پر عبور ہُوا

اُنہیؐ کے نام زمانے کا منتسب ہونا
دلیل ہے کہ یہ عرصہ نصابِ نُور ہُوا

خاور اعجاز

نعتؐ

ایسا لگتا ہے کہ بخشش کی ندا آئی ہے
گلشن طیبہ سے پھر مہکی صبا آئی ہے

خوب سے خوب ہوئی طرزِ عمل کی صورت
ذہن میں دل میں جو قرآں کی ضیا آئی ہے

تلخیءِ حشر میں رحمت سے سرافراز ہوئے
واسطے جن کے شفاعت کی ردا آئی ہے

ایسے برسے گی کہ سیراب زمانے ہوں گے
جانبِ بطحا سے گھنگھور گھٹا آئی ہے

روح کی وادی بھی سیراب ہوئی جاتی ہے
قریہءِ جاں میں مدینے سے ہوا آئی ہے

یاد آئے شہِ خوباں پہ ستم طائف کے
اک نمی سی مری آنکھوں میں رضا آئی ہے

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس رُخ کروں قصیدۂ شاہِ زمن تمام
تشبیب ہی میں ہو گئی تابِ سخن تمام

نعتؐ

مجھے بھی جائے جو لے کر خدا مواجہہ پر
کریں گے اشک مرے بات جا مواجہہ پر

ادب سے سر کو جھکا کر کھڑا رہوں گا میں
نہ لب سے نکلے گی کوئی صدا مواجہہ پر

کسی کو کہنے کی کچھ بھی کہاں ضرورت ہے
سنی ہی جاتی ہے دل کی نوا مواجہہ پر

وہ جان جائیں گے جیسا بھی حال ہے دل کا
بس ایک بار یہ پہنچے گدا مواجہہ پر

سلام پیش کروں گا میں اہتمام کے ساتھ
رہے گا ہونٹوں پہ صلی علیٰ مواجہہ پر

غلام ہوں سو حضورِ شفیع روزِ جزا
قبول ہو گی مری بھی دعا مواجہہ پر

کوئی بھی خالی نہیں جاتا آپؐ کے در سے
معافی ہو گی مجھے بھی عطا مواجہہ پر

نہیں سلیقہ حضوری نہ حاضری کا مجھے
ادب کو رکھوں گا لیکن روا مواجہہ پر

میں اس کو جانوں گا معراج زندگانی کی
سنا سکا جو میں حرف ثنا مواجہہ پر

سسک سسک کے گزاری ہے میں نے گو انجم
کروں گا شکوہ نہ کوئی گلہ مواجہہ پر

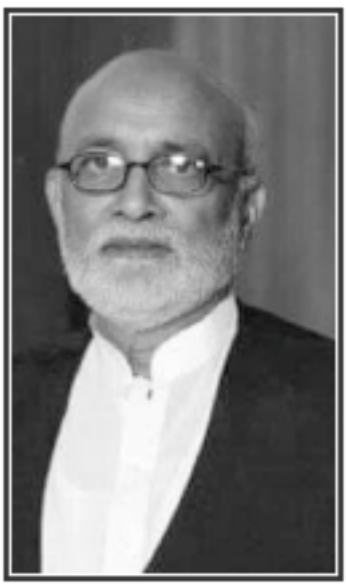

محمد افضال انجم

نعتؐ

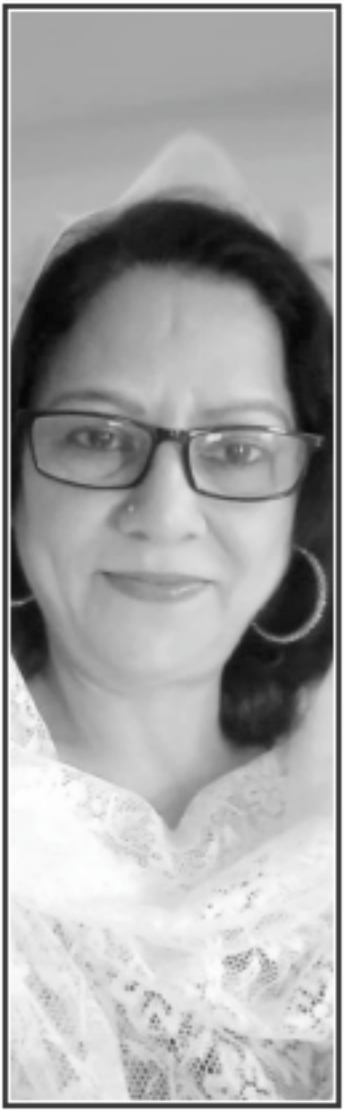

میرے آقا کے جو دربار میں آ جاتے ہیں
دامنِ رحمتِ سرکار میں آ جاتے ہیں

جب بھی ہم سیرتِ انوار، عقیدت سے پڑھیں
ہم بھی پھر چشمِ ضیاء بار میں آ جاتے ہیں

حسنِ قرآت نے سنوارے ہیں مرے شام و سحر
نور و ایمان کی اک دھار میں آ جاتے ہیں

مجھ کو مدحت کا سلیقہ ہی کہاں تھا پہلے
آپ کے خلق سے کردار میں آ جاتے ہیں

جب ہوں امت کے گنہگار کسی غم سے نڈھال
سایہء سیدِ ابرار میں آ جاتے ہیں

جب زمانے کی تھکن سے ہو بہت چُور بدن
اے مدینہ ترے گلزار میں آ جاتے ہیں

نعت کہنے کو قلم جب بھی اٹھاؤں افروز
حرف کے معجزے اشعار میں آ جاتے ہیں

افروز رضوی

نعتؐ

شرک سے پاک عبادات کی بنیاد پڑی
ربِّ واحد سے مناجات کی بنیاد پڑی

آپؐ نے بدلے جہالت کے سبھی طور طریق
آپؐ سے نوریں روایات کی بنیاد پڑی

آپؐ سے قبل غلاموں کی زباں بندی تھی
آپؐ آئے تو سوالات کی بنیاد پڑی

ہفت افلاک بچھے آپؐ کے نعلین تلے
اِس طرح سیرِ سماوات کی بنیاد پڑی

آپؐ آئے تو کدورت کی فضا چھٹنے لگی
بھائی چارے کی مساوات کی بنیاد پڑی

آپؐ سے قبل بھلا کون تھا ناداروں کا
آپؐ آئے تو مراعات کی بنیاد پڑی

آپؐ آئے تو مٹے سارے خرافاتِ جہاں
آپؐ سے حُسنِ کمالات کی بنیاد پڑی

آپؐ کی مثل کہیں چارہ گری کب تھی بھلا
ایسے عالم میں عنایات کی بنیاد پڑی

ایسے تاریخ میں انصار نے ایثار کیا
اِک نئے طرزِ مواخات کی بنیاد پڑی

اُنؐ کے ہر لفظ میں شامل ہے خُدا کی مرضی
اُنؐ سے دانائی کی ہر بات کی بنیاد پڑی

اُنؐ کی ہر بات سے عالم نے ضیا پائی ہے
اُنؐ سے پاکیزہ خیالات کی بنیاد پڑی

اُنؐ کے نعلینِ مبارک کا تصدق ہے نبیل
فرش پر عرشی مقامات کی بنیاد پڑی

آپؐ نے زیست کو پستی سے نکالا ہے نبیل
آپؐ سے اعلیٰ نظامات کی بنیاد پڑی

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

دلوں کا جو قرار ہے وہ نام ہے حضور کا
جو دائمی بہار ہے وہ نام ہے حضور کا

ازل سے تا ابد کے جتنے نام ہیں وہ لائیے
جو ان کا تاجدار ہے وہ نام ہے حضور کا

وہاں بھی ہوں گی عزتیں اسی کے دم سے حشر میں
یہاں بھی باوقار ہے وہ نام ہے حضور کا

یہ چودھویں کے چاند کی طرح سکون آفریں
جو مہرِ تابدار ہے وہ نام ہے حضور کا

خدا بھی ٹالتا نہیں وسیلہ ان کے نام کا
رضائے کردگار ہے وہ نام ہے حضور کا

اسی کے دم سے رحمتوں کا ہر طرف نزول ہے
کرم کا جو حصار ہے وہ نام ہے حضور کا

اسی لیے دیا گیا یہ انبیاء میں آپ کو
خدا کو جس سے پیار ہے وہ نام ہے حضور کا

زبان جس سے شیریں ہے وہ بات ہے حضور کی
جو لب پہ بار بار ہے وہ نام ہے حضور کا

ہمارے لب پہ سروران کا ذکر ہے اسی لیے
ہمارا غمگسار ہے وہ نام ہے حضور کا

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

دور قرطاس و قلم سے تیرگی ہو جائے گی
نعت جب ان کی لکھوں گا روشنی ہو جائے گی

حسن سرکار مدینہ کا ہے یہ بھی معجزہ
سیدھی سادی بات میری، شاعری ہو جائے گی

دل کے آئینے میں جب دیکھوں گا میں ان کا جمال
زندگی میری سراپا دل کشی ہو جائے گی

ان کی رعنائی سے کسب فیض کی بس دیر ہے
جگمگا اٹھیں گے تارے ، چاندنی ہو جائے گی

بزمِ ذکرِ مصطفیٰ میں ہے فرشتوں کا نزول
آتے جاتے میری ان سے دوستی ہو جائے گی

پھر کہاں پاؤ گے تم خوش بوئے اہل بیت یوں
دور جانا ان سے گویا خودکشی ہو جائے گی

وہ بلائیں اور میں سوچوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں
یہ تو سیدھی سیدھی ان سے بے رخی ہو جائے گی

بس کوئی آ کر سنا دے نعت کے دو ایک بول
دور جسم و روح کی درماندگی ہو جائے گی

عشق سچا ہو تو سارے فاصلے بے کار ہیں
دل ہی دل میں ان کے در پر حاضری ہو جائے گی

عملدار حسین

نعتؐ

مجھے دیکھو مری اوقات دیکھو
میں لکھ لایا ہوں پھر سے نعت دیکھو

ملائک انس و جاں سنتے ہیں مجھ کو
کہاں پہنچے مرے درجات دیکھو

ثنا خواں کے گناہوں پر نہ جاؤ
وہ کیا کہتا ہے اس کی بات دیکھو

پڑھو مدحت زوالِ وقت پر بھی
نہ دن دیکھو نہ اس میں رات دیکھو

فرشتو تم فرشتے ہو میں انساں
سو میرے نعت میں جذبات دیکھو

میں منکر اور نکیروں سے کہوں گا
مرے اعمال چھوڑو نعت دیکھو

صغیر احمد صغیر

عقیدت

پہنچ جاؤں اگر میں آپ کی سرکار میں پہلے
نکل کے دشت سے آجاؤں گا گل زار میں پہلے

میں اپنے قافلے سے اس لیے کچھ آگے چلتا ہوں
کہ آ جاؤں نگاہِ منبعِ انوار میں پہلے

اگر میں آپ کے عہدِ مبارک میں جنم لیتا
یقیناً نام آ جاتا مرا انصار میں پہلے

سپاہِ دینِ احمد کی صفوں میں اگلی صف ملتی
میں اپنی جاں لٹا دیتا رہِ ایثار میں پہلے

وہ خوابوں میں خیالوں میں نظر آ سکتے ہیں لیکن
کوئی شدت تو آئے خواہشِ دیدار میں پہلے

پھر اس کے بعد عشقِ مصطفےٰ کا دعویٰ جچتا ہے
کوئی خوبی تو پیدا کیجیے کردار میں پہلے

جو کل انسانیت کے واسطے ہو باعثِ رحمت
بشر ایسا نہیں آیا کوئی سنسار میں پہلے

حضورِ پاک کے ذکرِ مسلسل کا یہ صدقہ ہے
اثر ایسا نہ آیا تھا مرے اشعار میں پہلے

طالب انصاری

عقیدت

غازیِ احمدِ مختار ، امیرِ حمزہؓ
عاشقِ سیدِ ابرار ، امیرِ حمزہؓ

شیر اللہ کے وُہ شیر محمدؐ کے ہیں
سب شہیدوں کے ہیں سردار ، امیرِ حمزہؓ

اُن کی رگ رگ میں مچلتا ہے مودّت کا لہو
کملی والے کے وفادار ، امیرِ حمزہؓ

گریہ زاری مرے آقا نے کرائی کہہ کر
آپ کے ایسے ہیں دلدار ، امیرِ حمزہؓ

منزلیں فرطِ مسرّت سے قدم چُومتی ہیں
ہیں عجب قافلہ سالار ، امیرِ حمزہؓ

ہم غلاموں کی متاعِ دوجہاں ، یاد اُن کی
ہم فقیروں کو ہیں درکار ، امیرِ حمزہؓ

ذکرِ خیر اُن کا ہے رحمت کا خزانہ فیضانؔ
سر بسر مطلعِ انوار ، امیرِ حمزہؓ

فیض رسول فیضان

عقیدت

ہے اُمّ القریٰ مصدرِ نورِ حق
کھلا اُمیّوں پہ درِ نورِ حق

محمد کا اُسوہ محمد کا عشق
مدارِ عمل محورِ نورِ حق

ہے طے کر دیا یوم فرقاں نے خود
ہے ساتھ اُن کے اُونچا سرِ نورِ حق

ہے باطل کا توڑا گیا سر وہیں
ہے چمکا جہاں نیّرِ نورِ حق

رہے گی نہ طاغوت کی تیرگی
محمد ہیں پیغمبرِ نورِ حق

ہو مہمانِ سدرہ کا جس پر کرم
اُسی کو ملے شہپرِ نورِ حق

وہ اعلیٰ و اولیٰ وہ مولائے کل
وہ سید وہی سرور نورِ حق

وہ خیرالبشر وہ امامِ امم
وہی والیِ کشورِ نورِ حق

ہے بابِ کرم ان کا در تا ابد
اُنہی کو ملا کوثرِ نورِ حق

محمد پہ لاکھوں درود و سلام
ہے اُن کی ثنا گوہرِ نورِ حق

ہے ختمِ نبوت کا تاج اُن کے سر
ہے وہ تاابد افسرِ نورِ حق

ہیں جو اُن کے پرچم تلے، حشر بھی
ہے اُن کے لیے محشرِ نورِ حق

مرے ساتھ آصف! سخن بھی مرا
ہے ان کا گدا، نوکرِ نورِ حق

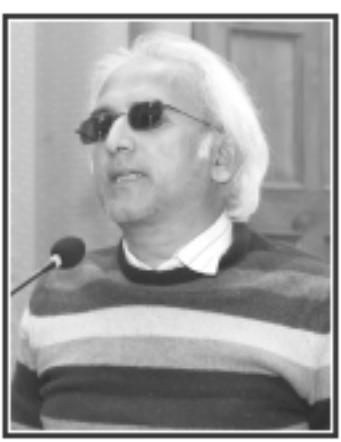

مرزا آصف رسول

عقیدت

نبی کا در ہے ایسا در جہاں خیرات ملتی ہے
یہاں پر مانگنے والوں کو یہ دن رات ملتی ہے

کوئی بیمار غم آئے تو مایوسی نہیں ہوتی
دوا ملتی تو ہے لیکن شفا بھی ساتھ ملتی ہے

سخن گوئی کا خوگر بھی یہاں سے فیض پاتا ہے
قلم قرطاس اس کے پاس ہو تو نعت ملتی ہے

یہاں پر آرزو کی کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں
کوئی کالی گھٹا اٹھتی ہے پھر برسات ملتی ہے

حبیب کبریا کی شان کچھ ایسی نرالی ہے
محبت مصطفیٰ سے ہو، خدا کی ذات ملتی ہے

مدینے کے شجر شاہد بڑے ہی بارآور ہیں
تمنا کر کے تو دیکھو ہر اک سوغات ملتی ہے

صوفی محمد ضیا شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گُل بن دیارِ علم کے پیروں کی گرد تھے
اک رنگ میں چنار ہوئے خار بن تمام

عقیدت

یہ کہ جو صبح کا اجالا ہے
تیری نعلین کا حوالا ہے!

کائناتِ خدا میں ہر سلطاں
کوچہِ مصطفیٰ کا پالا ہے

دشمنوں کو گلے لگاتے ہیں
جگ میں ان کا کرم نرالا ہے

یہ جہاں اس کو کیا گرائے گا
مصطفیٰ نے جسے سنبھالا ہے

بھیج کر آلِ مصطفیٰ پہ درود
زیست کی مشکلوں کو ٹالا ہے

تیرگی کے طلسم کو میں نے
عشقِ احمد سے کاٹ ڈالا ہے

وہ مدینے کی خاک ہے مہدیؔ
جو نجومِ فلک کا ہالا ہے!

غضنفر مہدی

عقیدت

اِک کلمہ مصطفیؐ کی طرف لے گیا مجھے
بعد از نبیؐ خدا کی طرف لے گیا مجھے

میں جانتی ہوں رازِ زمین اور آسماں
یہ راز انتہا کی طرف لے گیا مجھے

قرآن اور حدیث کی تعلیم پائی تو
رستہ یہ انبیاء کی طرف لے گیا مجھے

مجھ کو حضورؐ آپ نے جینا سکھایا تو
خود جس ہی ہَوا کی طرف لے گیا مجھے

میں نے جو اہلِ بیتؑ کی سیرت پہ کی نظر
منظر یہ اولیاءؒ کی طرف لے گیا مجھے

دنیا کے ازکیاؒ و اماموں کی بات تھی
یہ رمز صوفیا کی طرف لے گیا مجھے

میں تھی گناہ گار و خطاکار اے عمود
دستِ کرم جزا کی طرف لے گیا مجھے

عمود ابرار

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مٹی سے مس ہوئی وہ سرانگشتِ آفتاب
یک سر گلاب رُو ہوئے نسرین تن تمام

مناجات

کر کے ہر ایک سہارے سے کِنارا، مِرے رَب
مجھ کو درکار ہے اَب تیرا سہارا، مِرے رَب

تِرا دَر چھوڑ کے ، پھرتا رہا مارا مارا
آ گیا پھر میں ترے در پہ دوبارا ، مِرے رَب

اِک یہی در ہے ، جو ہر وقت کُھلا رہتا ہے
اِک اِسی در پہ ہے منگتوں کا اِجارا ، مِرے رَب

کوئی آغوش مجھے ڈھانپ لیا کرتی ہے
جب بھی چپکے سے تجھے میں نے پُکارا، مِرے رَب

اِس بھری دنیا میں، جی سکتا ہوں میں سب کے بغیر
نہیں ہے تو، ترے بِن ، میرا گزارا، مِرے رَب

میں نے چاہا ، ترے رستے پہ چلوں ، تیرا بنوں
تجھ کو معلوم ہے ، میں جیتا کہ ہارا ، مِرے رَب

ترے محبوبؐ کا دِیدار نصیب ہو جائے
میں نے پَل پَل اِسی خواہش میں گزارا، مِرے رَب

زندگی لے گی دمِ واپسیں ، جب آخری سانس
اِس سے پہلے ، کوئی بخشش کا اِشارا، مِرے رَب

محمد انیس انصاری

رباعیات

کافی نہیں کہنا کہ ستم نا حق ہے
روکو اسے ترکیب سے جیسا حق ہے
ظالم کی مذمت بھی نا کرنے والو
مظلوم پہ رونے کا تمہیں کیا حق ہے

.....

تیری طرف اخلاص شناس آ جاتے
دن میل ملاقات کے راس آ جاتے
آئے نہ پر و بال میسر ورنہ
جب چاہتے اڑ کر ترے پاس آ جاتے

.....

کیوں چل کے کسی اور طرف سے آؤ
تم سوئے شرف ، راہ شرف سے آؤ
ہے علم کا دروازہ علی شہر نبی
منزل ہے مدینہ تو نجف سے آؤ

.....

کم کم ہی طلب قرب کو تجتے دیکھی
ہر سیج رفاقت ہی سے سجتے دیکھی
لازم ہے کہ ہو دوسرا بھی اس میں شریک
ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتے دیکھی

.....

کچھ غور اگر ذہن بھی کرتا ترا
کچھ وقت خیالوں میں گزرتا ترا
حیراں ہیں تری بھوک پہ احباب ترے
بھرتا ہے شکم دل نہیں بھرتا ترا

.....

کرتی ہے پریشان بھی خلش راس بھی ہے
تنہائی میں یکجائی کا احساس بھی ہے
آنکھوں سے نہاں اور سکونت دل میں
اک وقت میں تو دور بھی ہے پاس بھی ہے

.....

عیسٰی کو جو فرزندِ خدا کہتے ہیں
کب حامیِ تثلیث بجا کہتے ہیں
لیکن ہو جو اللہ کے گھر میں پیدا
اے اہلِ بصیرت اسے کیا کہتے ہیں

گلزار بخاری

رباعیات

انجام کی آیات ہیں بستی کی طرف
اک طرز کی آفات ہیں بستی کی طرف
ہر چیز بکھرنے کے لیے آمادہ
پھیلی ہوئی اموات ہیں بستی کی طرف

.....

بے رحم ہے آسمان سب کہتے ہیں
اس زیست کو امتحان سب کہتے ہیں
دن رات یہاں چیخ کے لیکن خود کو
پیدائشی بے زبان سب کہتے ہیں

.....

آزادی سے چلنے کی سہولت تو ہو
اس جا سے نکلنے کی سہولت تو ہو
دُنیا کے بہت پیچھے بھی چلنے کے لیے
کچھ سوچ بدلنے کی سہولت تو ہو

.....

ہر سمت جو افکار کی زنجیریں ہیں
دراصل یہ بیکار کی زنجیریں ہیں
بچ جائیں اگر ان سے تو ان سے بڑھ کر
طبقات کے کردار کی زنجیریں ہیں

.....

گلشن ہے کہ صحرا ہے ہوا کی قسمت
کیسا ابھی خطہ ہے ہوا کی قسمت
خورشید اگرچہ ہے بہت جوبن پر
برسات کا نخرہ ہے ہوا کی قسمت

.....

صحرا کا سمندر ہے میری ٹھوکر پر
پانی کا بھی پتھر ہے میری ٹھوکر پر
بیٹا ہوں علیؑ کا تجھے معلوم نہیں
حالات کا خیبر ہے مری ٹھوکر پر

.....

کچھ دیر وہ ٹھہرا نہیں کم بخت ذرا
اک لفظ بھی بولا نہیں کم بخت ذرا
اب تک میں کھڑا ہوں اسی اک رستے پر
واپس کبھی آیا نہیں کم بخت ذرا

سعید اشعر

رباعیات

صورت ہو سائے کی کرن سے پیدا
عالم ہو رنگِ پیرہن سے پیدا
رقاصہ جو پہنے پرِ طاؤسِ خیال
ہو قوسِ قزح موجِ بدن سے پیدا

فن سے پہلے کمال تھک جائے تو
معراج نہ ہو زوال تھک جائے تو
طے تیرے خوابِ نیم عریاں کا سفر
بندہ نہ کرے خیال تھک جائے تو

تصویرِ صدا قوسِ قزح کی سی ہے
آواز میں لو رنگِ تماشا کی ہے
وہ لڑکی کفِ تاج محل کی قندیل
چہرے پہ حجابِ نور کی جالی ہے

پانی پہ کوئی نقش بنائے نہ بنے
پیمانہء رنگ آزمائے نہ بنے
تقدیر کہ ہے دستِ حوادث کی لکیر
تدبیر کے بیلچے اٹھائے نہ بنے

دل دوز تبسم پہ کلی روتی ہے
میت پر پھول کی ہنسی روتی ہے
ملتا نہیں خود سے کوئی ہارا ہوا شخص
اے عشق ترے غم میں خوشی روتی ہے

آرائشِ امکانی کے پردے پڑے ہیں
آئینے پہ حیرانی کے پردے پڑے ہیں
کھلتا نہیں عشق سے تمنا کا حجاب
تصویر پہ عریانی کے پردے پڑے ہیں

خورشید سوار اسم کے پار اترا
افلاک شکن طلسم کے پار اترا
طاؤس کے پیرہن تھے آواز کے رنگ
میں ایک دن اپنے جسم کے پار اترا

محمد نصیر زندہ

ہائیکو

اے خدائے عظیم تر مجھ کو
اپنی توصیف کا ہنر دے دے
ایک شاعر اگر بنایا ہے

.....

لب پہ سب کے درود ہوتا ہے
شام ہوتی ہے جب مدینے میں
روشنی کا ورود ہوتا ہے

.....

جب شہیدوں کا ذکر ہوتا ہے
آنکھ اندر سے نم پکڑتی ہے
یاد آتے ہیں کربلا والے

.....

امن کے پھول جب سلگتے ہیں
جنگ کے پتھروں کی آوازیں
فاختاؤں کی موت ہوتی ہے

.....

کوئی اس کا جواب دے نہ سکا
ایک بچے نے جب سوال کیا
کیوں یہاں قتل عام ہوتا ہے

.....

جنوری کی شدید راتوں میں
میرے جذبے ہوئے ہیں یخ بستہ
برف میں سو گیا ہے کیا سورج

.....

اڑتے چوروں نے
مار دیا معصوموں کو
قاتل ڈوروں نے

سن لیں گے سب چیخ
ظلم کو موت آجائے گی
بولے گی تاریخ

.....

کوئل کی آواز
دل پر دستک دیتی ہے
جیسے کوئی ساز

.....

ہر سو آتے ہیں
جب تاریکی بڑھتی ہے
جگنو آتے ہیں

.....

ڈار سے بچھڑی کونج
جس جانب بھی جائے گی
آتی رہے گی گونج

.....

زخموں کی تصویر
میرے دل کے اندر ہے
برسوں سے تحریر

.....

آگ لگاتے ہیں
لوگ یہاں کچھ ایسے ہیں
بات بڑھاتے ہیں

محمد نوید مرزا

''دِل دریا سمندروں ڈونگے''

میں لندن ایئر پورٹ پر اپنے سسرالی عزیزوں کو الوداع کہنے آئی تھی۔ وہ پاکستان واپس جا رہے تھے۔ میں اس وقت بے طرح اداس ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اُڑ کر پاکستان پہنچ جاؤں۔ مجھے اپنے سب عزیز رشتہ دار یاد آ رہے تھے، جن سے بچھڑے ہوئے مجھے پانچ برس بیت گئے تھے۔ شادی کا بندھن بھی کیسا انوکھا بندھن ہوتا ہے۔ یہ کیسا ناطہ ہے جو ایک اجنبی کے سنگ جڑتا ہے تو پھر اپنے پیاروں کو بھی بھلانا پڑتا ہے۔ وہ جن کے ساتھ خون کا رشتہ ہوتا ہے وہ جو رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ کیسے ان کی یادوں کے نہاں خانوں میں چھپا کر جینا پڑتا ہے۔

مہمان اندر لاؤنج میں جا چکے تھے۔ میں واپسی کے لیے مڑی تو کچھ فاصلے پر کھڑی ایک خاتون نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ بھی غالباً کسی کو سی آف کرنے یا ریسیو کرنے آئی تھی۔ میری طرف اس کی بیک تھی۔ لیمن ساڑھی میں اس کا جسم خطرناک حد تک خوب صورت لگ رہا تھا۔ وہ کسی سنگ تراش کا تراشا ہوا مجسمہ لگ رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی انڈین ہے۔

بے اختیار میرا دل چاہا کہ اس خاتون کا چہرہ بھی دیکھوں۔ میں تھوڑا آگے بڑھ کر اس کے سامنے پہنچ گئی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے سامنے پارو کھڑی ہے۔

ہم دونوں دیوانوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

''پارو.....میری جان تم کہاں؟''

''اور فریدہ تم یہاں کیسے'' پارو نے میرے ساتھ لپٹے ہوئے پوچھا۔

سیما پیروز

ہم دونوں کافی دیر اردگرد سے بے خبر ایک دوسرے سے لپٹی رہیں۔ ہماری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے ایک سانس میں پارو سے سوالات شروع کر دیئے۔

''ریاض بھائی کیسے ہیں؟'' اور تمھارا مُنا۔ وہ تو اب بڑا ہو گیا ہو گا۔ اور تم لندن کب آئیں؟''

''دھیرج..... میری جان دھیرج۔ گھر پر آؤ گی تو تفصیل سے باتیں ہوں گی'' اس نے مجھے اپنا ایڈریس دیا۔ گھر آ کر میں نے اسلم سے بھی پارو کا ذکر کیا۔ وہ بھی میری اتنی پیاری دوست کے ملنے کا سن کر خوش ہوا۔ مجھے اس سے تفصیلی ملنے کی از حد بے چینی تھی۔ اسلم دو روز کے لیے مانچسٹر جا رہے تھے۔ سو میں فری تھی کسی ننھے منے کھلونے کے وجود سے میرا گھر بھی خالی تھا۔ میں نے پارو کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں دو دن اس کے پاس رہوں گی، تو اس کی مسرت دیدنی تھی۔

''ریاض بھائی تو میرے یہاں رہنے سے ڈسٹرب نہیں ہوں گے۔'' میں نے پوچھا وہ خاموش رہی۔ اس کا بیٹا سکول گیا ہوا تھا گھر پر وہ اکیلی ہی تھی۔ میری آمد کی وجہ سے اس نے اپنی جاب سے چھٹی لے رکھی تھی۔ پارو کا فلیٹ نہایت خوب صورتی اور سادگی سے سجا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ، خاموش ہو گئی تھی۔ جسمانی طور پر اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لنچ پر اس کا بیٹا بھی موجود تھا۔ وہ بہت پیارا اور ذہین بچہ تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر مجھے کچھ الجھن سی ہو رہی تھی۔ میں بار بار ذہن پر زور دے رہی تھی کہ اس بچے کی شکل کس سے ملتی ہے۔ ڈنر پر بھی میں نے ریاض کو غیر موجود پایا، تو میں نے پارو سے پوچھا ''پارو ریاض کہیں گیا ہوا ہے۔''

''ہاں وہ پاکستان میں ہوتا ہے۔ میں یہاں اپنے بچے کے ساتھ اکیلی ہوتی ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' میں پریشان ہو گئی۔

''بیڈ روم میں چلو وقاص سو جائے تو پھر ہم آرام سے باتیں کریں گے۔''

پارو وقاص کو سُلا کر اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ اس کے بیڈ روم میں سب سے عجیب چیز وقار کی تصویر تھی۔

''فرو تم نے وقار کو پہچانا؟

''کیوں نہیں! اسکو کیسے بھول سکتی ہوں۔''

مجھے دُکھ نے آن گھیرا۔

مجھے ریاض کے بارے میں سب کچھ جاننے کی بے چینی تھی۔ مجھے پارو اور ریاض کے لو افیئر سے لے کر شادی تک کے سارے واقعات یاد تھے۔ کتنی مشکلوں سے ریاض

نے پارو سے شادی کی تھی۔ پھر اب یہ علیحدگی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

میں اور پارو ایف اے سے لے کر ایم اے تک کلاس فیلو تھے۔ پارو کالج اور پھر یونیورسٹی کی ذہین ترین لڑکی تھی۔ وہ پانچویں کلاس سے وظیفہ لے رہی تھی۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار تھا۔ اس کا نام تو مہ پارہ تھا مگر ہم سب اسے پارو کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ اگرچہ بہت حسین لڑکی نہیں تھی لیکن اس میں کوئی خاص بات تھی کہ وہ بہت حسین معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ پھر بھی اسے اپنی غربت کا کوئی کمپلیکس نہیں تھا۔ وہ حد درجہ خوددار اور پُراعتماد لڑکی تھی۔

پارو ذہین اور لائق ہونے کے علاوہ اور بھی بہت ساری خوبیوں کی مالک تھی۔ حسب معمول اُس نے بی اے میں ٹاپ کیا تھا۔ ہم دونوں نے یونیورسٹی میں ایم اے انگلش لٹریچر میں داخلہ لیا تو ہمارے گروپ میں خالدہ، اسماء، ریاض اور آفتاب کا اضافہ ہو گیا۔ ریاض، ایک مل اونر کا بیٹا تھا۔ یہ بڑی سی گاڑی میں یونیورسٹی آتا تھا۔ عام امیر لڑکوں کی طرح اخلاقی طور پر دیوالیہ نہیں تھا۔ پڑھائی میں بھی بہت اچھا تھا۔ لیکن قدرے مغرور تھا۔

مجھے پارو اور ریاض کی اولین ملاقات اور لڑائی یاد تھی۔ ہم لوگ کلاس میں تھے اور سر کسی موضوع پر لیکچر دے رہے تھے۔ لیکن ریاض شرارتیں کیے جا رہا تھا۔ پارو نے ریاض کی شکایت لگا دی اور سر نے ریاض کو کلاس سے باہر نکال دیا۔ جب ہم لوگ کلاس سے باہر نکلے تو ریاض دروازے میں کھڑا تھا۔

''آپ کو اپنے لائق اور ذہین ہونے کا بہت زعم ہے۔'' وہ غصّے سے پارو سے مخاطب ہوا۔

''زعم نہیں! بل کہ میں لائق اور ذہین ہوں'' وہ لفظوں کو چبا کر بولی۔

میں ڈر رہی تھی کہ کہیں پارو جھگڑ نہ پڑے کیونکہ وہ لڑکوں کی بدتمیزی بالکل برداشت نہیں کرتی تھی۔ وہ دونوں ایک دو منٹ تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر ریاض مسکرایا اور اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا

''گلیڈ ٹو میٹ یو''

اس دن سے ریاض بھی ہمارے گروپ میں آ گیا اور نہ جانے کب اور کیسے ریاض اور پارو بہت دور تک چلے گئے۔ اتنی دور کہ اب ان کی واپسی مشکل تھی، مگر پارو بہت حقیقت پسند لڑکی تھی وہ اکثر ریاض کو سمجھاتی تھی۔

''دیکھو ریاض مجھے اتنا اونچا مت اڑاؤ کہ

میں جب نیچے گروں تو کانچ کی طرح بکھر جاؤں۔ تم آسمان ہو اور میں دھرتی ان کا ملاپ کبھی ممکن نہیں۔''

ہماری کلاس میں ہی ایک اور لڑکا وقار بھی پڑھتا تھا۔ دبلا پتلا۔ منحنی سا نہایت ہی بیچاری سی پرسنیلٹی کا مالک تھا۔ ہم سب پر اچانک ایک دن انکشاف ہوا کہ وہ بھی پارو کا دیوانہ ہے۔ وہ پارو سے کبھی مخاطب نہیں ہوتا تھا بس دور سے اس کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔ ریاض کو معلوم ہوا تو وہ بہت ہنسا اُس نے پارو سے کہا کہ وہ وقار کو الو بنائے لیکن پارو نے سختی سے ڈانٹ دیا۔

''مجھے اس طرح کسی کے جذبات سے کھیلنا بالکل پسند نہیں۔''

''آخر ہرج کیا ہے؟ وہ جو مجنوں کی اولاد بنا پھرتا ہے۔ تھوڑا فن رہے گا۔''

''ریاض تم محبت کو کھیل سمجھتے ہو؟'' وہ اتنا بیوقوف نہیں کہ میرے اور تمھارے تعلق کو جانتے ہوئے بھی مجھ سے محبت کرے۔ اور اگر پھر بھی کرتا ہے تو میرے دل میں اس کی بڑی قدر ہے'' پارو نے ریاض کو اچھی خاصی ڈانٹ پلادی۔

ریاض قول کا سچا نکلا تھا۔ پارو اور ریاض کی منگنی ہو گئی تھی۔ خدا جانے اس نے کس طرح اپنے ماں باپ کو منایا تھا۔ بہرحال ہم سب بہت خوش تھے۔ ریاض نے ساری کلاس کو زبردست ٹریٹ دی وقار اس میں شامل نہیں ہوا۔ وہ دن بھر افسردہ سا گھومتا رہا۔

پارو کی منگنی کے بعد وقار کی دیوانگی کی حرکتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ پہروں پارو کو حسرت بھری نظروں سے تکتا رہتا۔ کبھی اپنی جان دینے کی دھمکی دیتا۔ پارو بیچاری اچھی خاصی بدنام ہو رہی تھی۔ وقار کی اول فول باتوں سے ریاض بھی خاصا ڈسٹرب رہتا تھا۔ وہ تو وقار کی اچھی خاصی ٹھکائی کرنا چاہتا تھا مگر ہم سب نے منع کیا کہ بات بڑھانے سے کیا فائدہ۔

ایک روز پارو مجھ سے بولی۔ ''فریدہ چلو ذرا مجھے وقار سے بات کرنی ہے'' میں اور پارو وقار کے پاس پہنچے تو وہ سٹپٹا کر کھڑا ہو گیا۔

''وقار تم مجھ سے محبت کرتے ہو'' پارو نے پوچھا''

میرا منہ حیرت سے کھل گیا وہاں جتنے لوگ کھڑے تھے سب حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ خاموش رہا۔

''ہاں یا نہ میں جواب دو'' پارو ڈپٹ کر بولی۔

''ہاں! میں آپ سے محبت کرتا ہوں'' وقار

مسکین سی آواز میں بولا۔

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ریاض کو چاہتی ہوں اور اب امتحانوں کے بعد ہماری شادی ہونے والی ہے۔''

''ہاں میں اس کے باوجود تم سے محبت کرتا ہوں۔ شدید قسم کی۔ اگر آپ مجھے نہ ملیں تو میں جان دے دوں گا۔''

''بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ کوئی کسی کے لیے جان نہیں دیتا۔ دیکھ لینا اگلے سال تمھارے ساتھ تمھاری بیوی ہوگی اور تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دو گے۔''

''نہیں میں ثابت کروں گا کہ میں نے آپ سے سچی محبت کی ہے''

''بہت دیکھے ہیں جان دینے والے۔ اب اگر تم نے ذرا سی بھی بکواس کی تو میں تمھارا سر پھوڑ دوں گی۔ شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں۔ چلے ہیں عشق فرمانے۔'' پارو خوب خوب بولی۔ میں اسے گھسیٹ کر لے آئی تھی۔ ورنہ شاید وہ جوتوں سے اس کی تواضع کر دیتی۔

پارو نے حسب روایت ایم اے میں ٹاپ کیا تھا۔ اسے امریکہ کا سکالرشپ ملا تھا۔ لیکن ریاض نے منع کر دیا۔ کیونکہ ان کی شادی ہونے والی تھی۔

''فرو کہاں گم ہو'' پارو نے مجھے میرے خیالات سے چونکا دیا۔

''میں حیرت میں گم ہوں کہ ریاض تو تم سے اتنی شدید محبت کرتا تھا۔ کتنی مشکلوں سے اس نے تم سے شادی کی تھی پھر یہ علیحدگی کیسے اور کیوں ہوئی؟ کیا اس کے گھر والوں نے کوئی رول پلے کیا؟''

''نہیں وہ لوگ تو آج بھی مجھے بہت چاہتے ہیں بس شاید ہم ہی ایک دوسرے کے لیے پُرخلوص نہیں تھے۔ شاید ہم نے دل سے ایک دوسرے کو چاہا ہی نہیں تھا وہ وقتی جوش اور جذبہ تھا۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''تمھیں یاد ہے نہ ہماری شادی والا دن'' وہ دور خلاؤں میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

''ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے''

''اور تمھیں اس دن کا ایک دردناک واقعہ بھی یاد ہوگا۔''

پارو اور ریاض کی شادی والے دن کے واقعات کی فلم میری آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔

بارات والے دن وہ آتشی لباس میں بہت ہی حسین لگ رہی تھی۔

''فرو میرا دل گھبرا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کچھ ہونے والا ہے'' اس کے ہاتھ یخ ہو رہے تھے۔

''پاگل ہوا ان شاءاللہ سب کچھ خیریت سے

ہوگا۔ بس گھر والوں سے جدائی کے خیال سے پریشان ہو۔ یہ تو ایک دن ہوتا ہی ہے۔ دل کو ڈھارس دو۔ لو بارات بھی آ گئی۔'' میں بارات کی آمد کا شور سن کر کھڑکی کی طرف بھاگی۔ نکاح سے تھوڑی دیر بعد جب لوگ کھانے میں مشغول تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا پارو کے کمرے میں آیا۔ اس وقت میں ہی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے پارو کی طرف ایک لفافہ بڑھایا'' یہ لفافہ صبح مجھے وقار صاحب نے دیا تھا اور انھوں نے کہا تھا کہ جب بارات آ جائے تو پھر دلہن کو دوں''

میں نے لڑکے سے لفافہ جھپٹ لیا۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے لفافہ کھولا پارو کا چہرہ املتاس کے پھولوں جیسا ہو رہا تھا۔

'الوداع'

میں تمھیں زندگی میں پہلی اور آخری بار خط لکھ رہا ہوں۔ جس وقت یہ خط تم تک پہنچے گا میں تمھاری دنیا سے بہت دور جا چکا ہوں گا تم نے کہا تھا کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا۔ مگر میں ثابت کر رہا ہوں کہ لوگ کسی کی خاطر مر بھی جایا کرتے ہیں۔

(وقار)

میری چیخ نکل گئی پارو بیہوش ہو چکی تھی۔ میں اسے بڑی مشکل سے ہوش میں لائی۔

'' پارو ہوش میں آؤ لوگ کیا سوچیں گے۔ ایسے ہی بکواس کرتا ہے۔ کوئی نہیں مرا ورا ہوگا۔'' میں نے پارو کو تسلی دی۔

''نہیں فروّا اس نے جان دے دی ہوگی۔ ایسے جنونی لوگ اسی طرح کے ہوتے ہیں۔'' وہ خطرناک حد تک پیلی ہو رہی تھی۔ میرا دل بھی گواہی دے رہا تھا کہ وہ مر چکا ہوگا۔

''تمھیں یاد ہے نہ اسی روز وقار نے خودکشی کر لی۔'' وہ خیالوں سے چونک کر بولی۔

''میں جب رخصت ہو کر ریاض کے گھر آئی تو میرا دل دُکھ کے بھاری بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ مجھے یہ خیال رہ رہ کے کچوکے لگا رہا تھا کہ میں ایک انسان کی قاتل ہوں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی میرا ہمدرد ہو اور میں اس کے سینے پر سر رکھ کر جی بھر کر رو لوں تا کہ میرے دل جما غبار دھل جائے۔

ریاض نے میری خاموشی اور افسردگی کا سبب پوچھا تو میں نے تھکن کا بہانہ کر دیا۔ ریاض بہت خوش تھا وہ چاہتا تھا کہ میں اس کی خوشی میں اس کا بھرپور ساتھ دوں۔

''دیکھا پارو! میری جان! آسمان اور زمین کا ملاپ'' میں بس اس کی صورت دیکھتی رہ گئی۔''

''کیا تم خوش نہیں ہو؟ میری تو مسرتوں کا

آج ٹھکانہ نہیں کہ میں نے آج اپنی حاصل زندگی کو پالیا۔'' مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیوں میں نے ریاض کو وقار کا خط دے دیا۔ بس یہیں سے میری بربادی کی داستان شروع ہوگئی تھی۔ ریاض کو خط پکڑا کر اس کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میرا خیال تھا کہ ریاض مجھے دلاسہ دے گا میرا غم بانٹے گا مگر ریاض نے مجھے اپنے کندھے سے کسی اچھوت کی طرح الگ کر دیا اس کے ہاتھوں میں اتنی سختی تھی کہ میں کانپ کر رہ گئی۔ ویسے کے دن وقار کی لاش ریلوے کی پٹڑی سے مل گئی تھی۔ اس دن کے بعد ریاض کا رویہ میرے ساتھ بالکل بدل گیا۔ وہ دن رات طعنوں سے میرے دل کو چھلنی کرتا رہتا۔ میں ذرا خاموش بیٹھتی ہوتی تو کہتا ''اپنا عاشق یاد آرہا ہوگا۔ واہ بھئی اس صدی میں بھی ہماری پارو بیگم کو ایسے عاشق نصیب ہوئے۔

کبھی کہتا ''اگر میں سب گھر والوں کو بتاؤں کہ اُن کی ستی ساوتری بہو کے ایک عاشق صادق ان کے حسن پر سے اپنی جان نچھاور کر چکے ہی تو کیسا رہے گا۔''

وہ ہر وقت مجھے کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ میرا دل جلانے کا وہ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ وہ میرا پرستار اور میرا محبوب ریاض نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ میں اس کا یہ روپ دیکھ کر دم بخود تھی۔ سب گھر والے مجھے بے حد چاہتے تھے۔ میں نے محبت اور خدمت سے ان کے دل جیت لیے تھے ایک ریاض تھا جو پتھر بن چکا تھا۔

تم ہی کہو فریدہ کیا میں انسان نہیں تھی پتھر تھی کہ ایک انسان کی موت مجھ پر اثر انداز نہ ہوتی۔ بجائے اس کے کہ ریاض مجھے تسلی دیتا اس کے دن رات کے طعنے مجھے وقار کو ایک پل کو بھی بھلانے نہیں دیتے تھے۔ جن دنوں میں ماں بننے والی تھی۔ ان دنوں ریاض کا رویہ قدرے بہتر ہو گیا تھا۔ لیکن جب وقاص پیدا ہوا تو میرے لیے عذابوں کے نئے در کھل گئے۔ اُٹھتے بیٹھتے کہتا ''کہ اس کی شکل تو بالکل وقار پر ہے۔ لگتا ہے شادی سے پہلے پیدا ہونے والا تھا۔'' ایسے گندے اور رکیک الزام مجھ پر لگاتا کہ میں سُن ہو جاتی۔

میں اس کی ان بیہودہ باتوں کے جواب میں خاموش رہتی تو اس سے یہ بھی برداشت نہیں ہوتا تھا۔ ''جواب کیوں نہیں دیتی؟'' سچ کہتا ہوں نہ اس لیے'' حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ بکواس کر رہا ہے۔ انہی جھگڑوں میں وقاص ایک سال کا ہو گیا۔ تو اُس نے دوسری شادی کی رٹ لگا دی۔

سارے گھر والے اس کے پیچھے پڑ گئے۔ ریاض کی امی نے اسے خوب ڈانٹا۔

''کیا کیڑے پڑ گئے ہیں پارو میں۔ یا تو اس کی خاطر جان دے رہا تھا اب مل گئی ہے تو دل سے اُتر گئی ہے، تم مردوں کا یہی وطیرہ ہے ہمارے جیتے جی تو بہو پر سوت نہیں لا سکتا۔ اس کا قصور کیا ہے؟ اللہ نے تجھے چاند سا بیٹا دیا۔ کیوں خدا کی ناشکری کرتا ہے۔''

حالات دن بدن بہت ہی خراب ہوتے جا رہے تھے۔ ریاض میری اور بچے کی صورت سے بیزار تھا۔ وقاص کو بلاجہ پیٹ دیتا تھا۔ میں نے خاموشی سے دوبارہ سکالرشپ اپلائی کر دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے دوبارہ سکالرشپ مل گیا اور میں کسی نہ کسی طرح یہاں آ گئی۔ یہاں آئے مجھے پانچ برس ہو چکے ہیں۔ ریاض نے میرے آنے کے بعد آفس کی سیکرٹری سے شادی کر لی تھی لیکن چند مہینوں کے بعد چھوڑ دیا تھا۔ پچھلے سال مجھ سے معافی مانگنے آیا تھا مگر میں نے واپس لوٹا دیا۔''

''کیوں واپس لوٹا دیا پاگل ہو بالکل صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ اسے معاف کر دو۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''نہیں فریدہ! میرا اب دل ہی نہیں مانتا۔ بہت سوچا کہ دوبارہ اس کے ساتھ سمجھوتہ کر لوں۔ مگر اب ریاض کے ساتھ کا سوچ کر ہی گھن آتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے اس سے کبھی محبت کی ہی نہیں تھی۔''

''یہ تمھارا وقتی غصہ ہے۔ ریاض تمھیں بے حد چاہتا ہے اور چاہنے والوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

''نہیں فریدہ ریاض کو بھی مجھ سے محبت نہیں تھی۔ وہ اس کا وقتی جذبہ تھا۔ میں اس کے لیے صرف دل پسند کھلونا تھی۔ جسے وہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''میرے تو اب دل کے ہر کونے پر وقار کا قبضہ ہے۔ اس نے اپنی جان دے کر مجھے میری نظروں میں معتبر کر دیا ہے۔ میرے لیے اس کی یادیں ہی کافی ہیں۔ 'فروا! میں اس قابل تو نہ تھی کہ کوئی میرے لیے اپنی جان ہار دے'' وہ میری گود میں منہ چھپا کر رو پڑی۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو چھلک پڑے۔ میرے لبوں پر بے اختیار صوفی بزرگ سلطان باہو کے کلام کا یہ مصرعہ آ گیا:

''دل دریا سمندروں ڈونگے
تے کون دلاں دیاں جانے ہو''

☆☆☆☆☆

منکہ ایک مسافر

مجھے معلوم ہے کہ آپ حیران ہو رہے ہوں گے اس صندوقچے کو زبان کہاں سے مل گئی۔ میں خود کو حیران ہوں مگر قدرت کی قدرت ہے کہ آج میں انسانوں سے مخاطب ہوں ورنہ جو عمر بھر دوسروں سے گفت وشنید کرتا رہا اور محسوس کرتا رہا اور وہ کیسے آپ تک پہنچاتا۔ یہ جو آپ کو میرے جسم پر ڈب کڑھے نشان نظر آ رہے ہیں اصل میں ایک یہ داستان لکھی ہوئی ہے۔ سفر در سفر کی اور ایک زندگی کے سفر کی سفر میری اور میرے صاحب کی۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے کہ جب میرا صاحب نیا نیا نوکری میں آیا تھا فارن سروس آف پاکستان کچھ نام ہی ایسا تھا کہ اس کے ساتھ ایک تفاخر اور عزت منسوب ہے۔ صاحب میرا تھا تو ایک چھوٹے گاؤں کا مگر اس نے اپنی محنت سے یہ مقام حاصل کر لیا۔ گاؤں والوں کو امید تھی کہ یہ بہت بڑا سرکاری افسر بنے گا۔ سرکار کا مطلب تھا یا پٹواری یا کانسٹیبل مگر یہ تو کچھ اور مشکل سا نام تھا۔ بہر حال صاحب خوش تھا۔ صاحب کے گھر والے بھی گاؤں والے تھے انھیں ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ فارن سروس کیا ہے مگر یہ پتا تھا کہ اس کے لوگوں کو باہر کا سفر کرنا پڑتا ہے اور وہ گورے ٹائپ لوگ ہوتے ہیں سو اس کے باپ نے اس کی نوکری کی خوشی میں مجھے تحفہ کے طور پر پیش کیا۔

اس طرح اس لمبے سفر کا آغاز ہوا جس میں میں اور میرا صاحب ملک ملک پھرے دیس دیس کی خاک چھانی کبھی دنیا کے اس سرے پر کبھی اس پر اور کہیں بھی دو تین سال سے زیادہ نہیں۔ جب میں ذرا موسم کا عادی ہوا زبان اور مزاج سمجھنے لگا حم ہوا کہیں اور چلو شروع میں بہت تنگ ہوا کہ یہ کیا پھر سوچا شاید وقت کے ساتھ ساتھ عادی ہو جاؤں گا ماہر ہو جاؤں گا مگر وقت کے ساتھ ساتھ عادی اور ماہر تو نہیں ہوا کہ نہیں بوڑھا ضرور ہو گیا ہمت کمزور پڑ گئی ہر بار دوستوں کو خدا حافظ کہنے سے انسان جلدی بوڑھا ہوتا ہے کیوں کہ بچپن کے دوست بچپن محفوظ رکھتے ہیں مگر ہاں پرانے سائے پرانا دوست بھی 3 سال سے زائد پرانا نہیں۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا میرے صاحب کی عادتیں بدلتی گئی اور اس سے سگار بھی پینا شروع کر دیا انگریزی بھی کچھ عجیب لہجے سے بولتا تھا۔ مجھ سے بھی سگریٹ کی بو آنے لگی۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ میں اپنی ذات سے اتنا متنفر کیوں ہے اور اپنی اصلیت چھپانا کیوں چاہتا ہے جو اصل ہے اس کا اپنا اور اس کے ملک کا وہ دنیا کو کیوں نہیں دکھاتا۔ کیوں خود سے شرماتا ہے۔ مگر لگتا تھا کہ شاید وہ اپنے ملک کی نہیں بلکہ ملک کے ایک خاص طبقے کی نمائندگی کرنا چاہتا تھا اور اس چیز میں اپنا آپ اور اپنے ملک کی خوشبو اس سے دور ہوتی چلی گئی۔

ظہور احمد

پھر اس کی پوسٹنگ UN Division میں ہوئی تو روز کانفرنسز میں دور دور آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ ایسے میں اس نے ایک چھوٹا بیگ بھی ساتھ رکھ لیا، جس میں اس کا لیپ ٹاپ وغیرہ تھا۔ میں اکثر چھوٹے سے پوچھتا کہ ان کانفرنسز سے ملتا کیا ہے، تو اس نے کہا کہ ملتا پتہ نہیں کیا صاحب انگریزی بڑی فرفر بولتا ہے۔ اور جب وہ تقریر کرتا تو سننے والوں کی ساری طاقت اس کی سینے میں سما جاتی ہے۔ بات پہ بات جھنڈا اُٹھا دیتا ہے سب کی توجہ اس پر رہے مگر لگتا ہے کہ اس کی تقریر پانی پر تحریر ہے سب دیکھتے ہیں مگر یاد کوئی نہ رکھے۔

پھر شادی ہوئی ایک حسین سی خوشبودار صندوقچی میرا ہم سفر بنی اس کے ساتھ میں ہر چیز بانٹ سکتا تھا مگر پھر بھی کبھی کبھی وہ ایسی فرمائش کرتی کہ جس کا جواب میرے پاس نہ ہوتا۔ پھر بچے ہوئے شوخ رنگ بہ رنگے ساتھی آئے ان کے ساتھ دل بہل گیا مگر کبھی سوچتا کہ میرے اندر کی خاموشی کا کوئی ساتھی بھی تو ہو۔ دفتر کے دوست تھے مگر ان کا اعتبار نہ تھا اس نوکری نے ان کی عادت ہی بنا دی تھی کہ اندر کے احساس کو چھپاتے ہوئے وہ سوچ سمجھ کر بات کرتے اب کیسے پتہ چلے ان کی دوستی احساس کی تھی یا سوچ کی۔

کئی بار مجھے خدشہ ہوا کہ آپ مجھے بہت بوڑھا دیکھ کر صاحب کہیں نیا صندوقچہ لے لے مگر ہر بار جب کچھ پیسہ آتا تو بچوں کے لیے نیا سامان آ جاتا مگر صاحب کے پاس مجھے بدلنے کے لیے پیسے ہی نہ بچتے اور میں وہیں رہتا سچ پوچھئے تو میں روز روز کے سفر میں تنگ تو تھا مگر دل نہیں کرتا تھا کہ یہ سفر ختم ہو۔ کچھ ایسا ہی حال میرے صاحب کا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ باہر کے لوگ بڑے متاثر ہوئے مجھ سے میرے رکھ رکھاؤ سے میرے اوپر گئے مختلف اثر ایئر لائنز کے شیکرز ہے مگر اندر کا حال کوئی نہ بہتر جانے تو بہتر ہے میرے اندر Stylish سوٹ تھے ان کی پھٹی ہوئی جیبیں کوئی نہ دیکھے تو بہتر ہے۔

ایک بار Other Wings کے ایک بکسے سے ملاقات ہوئی وہ ایک ہی بار ملک سے نکلا تھا مگر کیا ٹھاٹھ تھے۔ ادھر مجھے یہ فخر تھا کہ میں نے دنیا گھومی یہ مجھ سے کچھ سیکھ لیں تو ان کے لیے اچھا ہے سو کچھ نہ سیکھ سکی۔

اکثر سفر میں میری ملاقات سمندر پار پاکستانیوں کے صندوقچوں سے ہوتی۔ یہ عجیب قسم کی مخلوق تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے گاؤں کی مٹی کا غبار ان کے اصل رنگ کو چھپا رہا تھا۔ ساگ اور لہسن کی بو سے بھی گھن کھاتا سوچتا کہ ایسے لوگ میرے ملک سے دور رہ کر بھی اس کو نہیں بھلور ہے اور اپنے تحفوں اور مٹی آڑوں سے ملک سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال میرے صاحب کا تھا اس کو ملک کی نمائندگی کے حسین پہلو تو سارے پسند تھے مگر ملک سے دور ہم وطنوں سے تعلق نہیں رکھنا چاہیے تھا۔

پھر وہ اہم سفر آیا جب میرا صاحب سفیر بنا۔ اب ایک خاص رعونیت میں نے بھی محسوس کی اب وہ مجھے کم ہی ہاتھ لگاتا۔ اور اس کے کالرز میں اکڑ سی آ گئی۔ مگر یہ چند دن کی بہار تھی کہ جب تھی تو مجھے لگتا تھا کہ میں پیدا ہی ایسا ہوا تھا نہ تو پہلے اس منصب سے کم سے ترقی پائی نہ بعد میں یہ منصب کھونا تھا۔

آج میں سوچتا ہوں کہ کتنے دکھ تھے زندگی میں کتنے طلاطم مگر پھر یہ سوچتا ہوں کہ میری اور اسکی زندگی کتنی خوش نصیب تھی کہ ایک وابستگی پر نثار ہو گئی تمام عمر کے لوگ ہمیں پاکستان کے نام سے جانتے رہے یہ کتنوں کا نصیب ہے۔

☆☆☆☆☆

شکستِ آرزو

''کیا بات ہے شاہد! تم اس قدر پریشان؟ ہم کل سے تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں اور تم ہو کہ کمرے میں بند۔ کیا کمرے کی چابی کھو گئی ہے کیوں' جو کمرے سے باہر نکلنے سے قاصر ہو'' افضل نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولنا شروع کر دیا نہیں یار! افضل۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ۔ '' ایسی کوئی بات نہیں۔'' تو پھر کونسی ایسی بات ہے جو حضرت آج کل نظر نہیں آ رہے اور بالآخر یہاں آنا پڑا'' افضل نے شاہد کی بات کو درمیان سے اچکتے ہوئے پوچھا اس سے پہلے کہ شاہد کوئی جواب دیتا افضل خود ہی بول پڑا۔ ہم تو سوچ رہے تھے خدانخواستہ طبیعت خراب نہ ہو۔ مگر طبیعت سے تو ظاہر ہے ابھی کسی پہلوان سے کشتی لڑو گے۔ اس بار شاہد کو غصہ آ گیا اور گرم لہجے میں کہا یار تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ اپنی ٹرٹر بند کرو تو میں کچھ بتاؤں شاہد نے جھلاتے ہوئے افضل سے کہا۔ اوہو..... ہو..... ہو یار۔ تم پر تو واقعی سنجیدگی کا شدید دباؤ ہے۔ افضل نے شاہد کے تیور دیکھتے ہوئے کہا۔ اچھا؟ میں بھی سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔ بتاؤ کیا بات ہے قسم سے اپنے دوست کے لئے تو جان بھی حاضر ہے افضل یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ نہیں میرے دوست! میں اتنا خود غرض نہیں کہ اپنے کسی دوست کی جان لوں۔ میں دوستوں کی قدر کرتا ہوں اس وقت جان کی نہیں تمہارے مشورے کی ضرورت ہے ایک اُلجھن ہے جو سلجھے تو سکون ملے۔ اسی لیے کل سے باہر نکلنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ شاہد نہایت سنجیدہ ہو کر افضل سے بات کر رہا تھا۔ تو پھر بتاؤ دوست کونسی بات نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے جو کچھ بھی ہو سکا یہ ناکس و ناچیز تمہارے لیے ضرور کرے گا۔ افضل نے شاہد کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''بات یہ ہے دوست کہ والد صاحب میری شادی کرنا چاہتے ہیں' میں لیکن میں'' ابھی الفاظ شاہد کے منہ سے پورے ادا بھی نہ

نازاوکاڑوی

ہوئے تھے کہ افضل بے تحاشہ ہنسنے لگا اور دیر تک ہنستا رہا۔ شاہد افضل کے اس رویے پر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ سنو افضل اس سے قبل کہ میرا ہاتھ تم پر اُٹھ جائے نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ مجھے مستقبل کی فکر کھائے جا رہی ہے اور تم میری بربادی پر قہقہے لگا رہے ہو؟ تم کیسے دوست ہو' جو دوست کا غم بھی نہیں پہچانتے تم کیا میری مدد کرو گے۔ شاہد غصہ میں کیا بول رہا تھا اسے کچھ ہوش نہ تھا اور افضل کا ہنستے ہوئے بُرا حال ہو رہا تھا'' شاہد! تم ابھی بتا رہے تھے'' میں ایک اُلجھن میں گرفتار ہوں'' کیا یہی اُلجھن ہے تمہاری ایک زمانہ تھا جب لڑکیوں کو شادی کے لیے کہا جاتا تو وہ میکہ کی جُدائی کا سوچ کر پریشان ہو جاتیں۔ آج کل تو لڑکیاں شادی کا سُن کر شرماتی بھی نہیں۔ وقت رُخصتی یہ سوچ کر روتی بھی نہیں کہ اتنے پیسے دے کر بیوٹی پارلر سے کرایا میک اپ خراب نہ ہو جائے۔ اور تم ہو کہ مرد ہو کر اسے اُلجھن بنا بیٹھے ہو۔ ہت تیرے کی۔ کھودا پہاڑ نکلا چوہا حسب عادت افضل نے شاہد کا پھر مذاق اُڑایا۔ ٹھیک ہے افضل تم مجھے حال پر چھوڑ دو۔ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ شاہد ایک دم چلا اُٹھا۔ تو پھر کیا بات ہے افضل نے بات پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ پلیز۔ خدا کے لیے میری پوری بات سن لو۔ پھر جو جی میں آئے بکنا شاہد نے کہا۔ اچھا تو بتاؤ افضل نے صبر سے کام لینے کی ٹھانی۔

ابا جان میری شادی کرنے پر تلے ہوئے ہیں لیکن میری ایک شرط ہے۔ شاہد نے کہا کیا کہا شرط۔ کونسی شرط افضل نے پوچھا۔ شرط یہ ہے کہ جس سے میری نسبت ٹھہرے میں اسے پہلے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ شاہد نے بالآخر اپنے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔ کیا واہیات ہے شرط تمہاری۔ کیا تم نے یہ شرط رکھتے ہوئے کچھ سوچا ہے۔ افضل نے غصے اور حیرانی کی ملی جُلی کیفیت کے ساتھ شاہد سے پوچھا۔ ہاں دوست شاہد نے بڑے اطمینان کے ساتھ جواب دیا آخر تم نے ایسا سوچا ہی کیوں افضل نے پھر بے یقینی جیسے انداز سے کہا۔ تمہاری حیرانی بجا ہے میرے دوست۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ یہ واقعہ میرے ساتھ نہ دُہرایا جائے۔ اگر سچ پوچھو تو یہ میری آرزُو ہے۔ ''بھاڑ میں جائے تمہاری یہ آرزُو شاہد۔'' افضل نے شاہد کو درمیان میں ٹوک دیا کیا واقعہ ہُوا تھا اس نے اس واقعہ کی طرف دھیان دلایا۔

سنو دوست شہر میں میرے ایک دوست کی شادی زبردستی ایسی لڑکی سے کر دی گئی جو میرے دوست کا آئیڈیل نہیں تھی - یہ آئیڈیل کیا ہوتا ہے شاہد! افضل نے چبھتے ہوئے انداز سے پوچھا- نادان نہ بنو افضل آئیڈیل کیا ہوتا ہے تم اچھی طرح جانتے ہو- شاہد نے افضل کو جواب دیتے ہوئے کہا گو کہ لڑکی مالدار تھی تعلیم یافتہ تھی لیکن خوبصورت نہیں تھی- وہ چاہتا تھا کہ سوسائٹی کی محفلوں میں ہم جائیں تو لوگ ہماری جوڑے کی تعریف کریں- اتفاق سے شادی کے فوراً بعد اسے ایک محفل میں جانے کا موقعہ ملا- وہاں کسی منچلے نے فقرہ کس دیا- اس نے اس بات کا بہت اثر لیا اور گھر سے اکٹھے نکلنا بند کر دیا - آہستہ آہستہ وہ دوستوں سے دُور ہوتا گیا - ایک دن اچانک غائب ہو گیا آج تک اس کی کوئی خبر نہیں - اب تم بتاؤ اگر میرے ساتھ بھی ایسا ہُوا تو افضل جو بڑے انہماک سے شاہد کی داستان سُن رہا تھا- شاہد ایک بات تو بتاؤ- ہاں شاہد نے بڑی توجہ سے جواب دیا شاہد تمہاری جدید تعلیم نے تمہاری دینی تعلیم بھلا دی ہے! یا پھر تیری عقل پر پردہ ڈال دیا ہے- اللہ تعالیٰ نے عورت کو پاکیزہ ہستی قرار دیا ہے اور چراغ خانہ کہا نہ کہ رونق محفل- تم جیسے لوگوں نے اپنے پراگندہ خیالات سے معاشرے کو خراب کر رکھا ہے- عورت کوئی نمائشی ماڈل نہیں جو تم اسے سڑکوں یا شوروموں میں سجا رکھو- عورت ایک روشنی ہے- عورت ایک خوشبو ہے جو اپنے پیار کی مہک سے سارے گھر کو معطر رکھتی ہے- کہیں جنت کی شکل میں موجود ہے تو کہیں قلب ونظر کی ٹھنڈک ہے- شاہد کیا تم بھی عورت کو زینت محفل بنانا چاہتے ہو- ارے پاگل عورت خوب صورتی سے نہیں خوب سیرتی سے پہچانی جاتی ہے اور پرکھی جاتی ہے- میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا گاؤں سے شہر جا کر تمہارے خیالات اس قدر بدل جائیں گے- نہیں دوست تم مجھے غلط سمجھے ہو- میں عورت کی دل کی گہرائیوں سے عزت کرتا ہوں- نہیں شاہد اگر تمہارے دل میں ذرا بھی خیال ہوتا تو تم ایسی بات کبھی سوچتے بھی نا- اب افضل غصے میں بولے جا رہا تھا- اس کے دل میں ایک ہیجان بپا ہو گیا تھا- اسی حالت میں اُٹھ کر جانے لگا تو شاہد نے آگے بڑھ کر روک لیا- افضل خدا کے لئے مجھے غلط مت سمجھو دراصل میں اپنی شدید آرزُو کے

ہاتھوں مجبور ہوں۔ افضل اگر تم چاہو تو ایسا ہوسکتا ہے۔ والد صاحب تمہاری بات مان لیں گے اور پھر ابھی تو تم جان دینے کا کہہ رہے تھے شاہد نے تُرپ کا پتہ پھینکا۔ افضل نے غصہ بھری نظروں سے شاہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کتنے خودغرض ہو شاہد اپنی ادنیٰ سی آرزو کے لیے مجھے آزما رہے ہو۔ میں کوشش کروں گا لیکن میری ایک بات یاد رکھنا تیری آرزو تجھے مہنگی پڑے گی۔

افضل کے کہنے پر شاہد کے گھر والے رضامند ہو گئے کہ نسبت ٹھہرانے سے قبل ہم ضرور بات کریں گے۔ اسی دوران ایک گھرانہ میں شاہد کے والد نے بات چھیڑی بات پکی ٹھہرانے سے قبل لڑکی' لڑکے کو دکھانے کی بات کی تو اُنہوں نے اپنی روایات کے مطابق انکار کر دیا۔ شاہد کے والدین نے تھوڑی پس وپیش کے بعد ہاں کر دی۔ یہ سوچ کر لڑکی بہت خوبصورت ہے یقیناً شاہد کو پسند آئے گی۔ ادھر شاہد کو جب پتہ چلا کہ بغیر لڑکی دکھلائے بات پکی کر لی گئی ہے تو وہ تلملایا۔ گھر والوں سے احتجاج کیا لیکن گھر والوں نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ لڑکی اچھی ہے تمہیں یقیناً پسند آئے گی۔ وہ دن بھی آن پہنچا جب شاہد سہرا لگائے دل میں آرزُو لئے خوشیوں کے آنگن میں بیٹھا تھا عین نکاح کے وقت شاہد نے ضد کر دی۔ نکاح سے قبل لڑکی ضرور دیکھوں گا۔ شاہد کا یوں کہنا تھا کہ ایک کہرام مچ گیا ایک شور تھا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہ دے رہی تھی۔ شاہد کے والد بھی اس اچانک افتاد سے گھبرا گئے۔ دونوں طرف کے بزرگوں نے بات سلجھانے کی کوشش کی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ بارات دروازے پر بیٹھی ہے۔ شکل دکھانے میں کیا حرج ہے۔ کچھ مخالفت بھی کر رہے تھے۔ لڑکی والے پہلے ہی یہ شرط مسترد کر چکے تھے۔ شاہد کے والد یہ بات مان رہے تھے لیکن شاہد کے اس اچانک رویے سے خاصے پریشان تھے۔ ابھی کوئی بات طے نہیں پا رہی تھی کہ اچانک شور تھم گیا دُلہن گھونگھٹ اُٹھائے دولہا کے پنڈال میں چلی آئی۔

شاہد اس حسن مجسم کو سامنے پا کر دیکھتا ہی رہ گیا قدرت کے اس حسین کرشمے پر حیران تھا۔ لبوں پر جیسے تالا لگ گیا ہو آنکھیں جیسے پتھرا گئی ہوں۔ یہ تم نے کیا کیا بیٹی تم یہاں کیوں چلی آئی۔ مجھے ایسا گھر نہیں چاہئے وہ افراد پسند نہیں جنہوں

نے میری بیٹی کو پہلے دن ہی بے آبرو کر دیا۔نکل جاؤ میرے گھر سے دُلہن کے باپ نے شاہد کو بازوؤں سے پکڑ کر دھکا دیتے ہوئے کہا پھر شاہد کے والد سے مخاطب ہوئے۔ بھائی صاحب اگر آپ کے بیٹے کو آپ پر اعتماد نہیں تھا تو آپ نے یہ قدم کیوں اُٹھا؟ ہمیں سر بازار کیوں رسوا کیا۔ ہمارا کیمہ مجھے بھی کم نہیں ہے۔ شاہد کا والد بھی نگاہیں نیچی کیے کھڑا تھا۔ شاہد تھا کہ مارے خوف کے پیلا پڑ رہا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ حالات اس سطح تک آ جائیں گے۔ اس کی سمجھ جواب دے چکی تھی۔ شاہد تھا کہ مارے خوف کے پیلا پڑ رہا تھا۔والد صاحب سے آنکھیں ملاتے ندامت ہو رہی تھی۔ اسی اثنا دُلہن شاہد کے قریب آ کر بولی لیجئے حضرت بندی حاضر ہے اور اظہار پسندیدگی سے آگاہ چاہتی ہے۔ شاہد جو نگاہیں نیچے کیے اپنے کیے پر نادم کھڑا تھا۔ سوچا شاید میرے جواب سے حالات میں ٹھہراو آ سکے۔ ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ جی میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے اپنی غلطی احساس ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مجھے معاف کر دیں۔

لیکن آپ نے اپنی پسند کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ دُلہن نے پھر اپنے الفاظ دُہرائے۔ مجھے آپ ہر طرح سے پسند ہیں۔ مجھے اور شرمندہ نہ کریں شاہد نے بدستور نگاہیں نیچی رکھتے ہوئے جواب دیا۔

آپ کیا سمجھتے ہیں آئیڈیل صرف مرد ہی بناتے ہیں۔لڑکیوں کے دل میں کوئی ارمان نہیں ہوتے۔ ان کے بھی جذبات ہوتے ہیں۔ آئیڈیل وہ بھی رکھتی ہیں لیکن ہم اپنے والدین کی عزت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہیں۔ بی۔اے' ایم۔اے کے باوجود صرف والدین کی عزت کی خاطر کم تعلیم یافتہ اور اَن پڑھ اور شکل وصورت کو خاطر میں لائے بغیر اسے اپنا مجازی خدا مان لیتی ہیں۔ اور تم جیسے کسی کی آبرو کو سر بازار نیلام کرنا بھی عار نہیں سمجھتے۔ جایئے حضور ہمارا بھی ایک آئیڈیل ہے اور وہ آپ نہیں ہے۔

شاہد کو سکتہ ہو گیا اندر سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا۔ شاہد کی اندرونی توڑ پھوڑ بھی صرف افضل ہی جان سکا۔ شاہد کی آرزُو کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ بھری محفل میں وہ رد کیا جا چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

پرائز بانڈ کی تلاش اور قسمت

رانا محمد شاہد

اختر کے کمرے کی دیواروں سے جھڑتا ہوا پلستر اس کی زندگی کی بوسیدگی کا پتا دے رہا تھا۔ پنکھا اپنی پوری سکت کے ساتھ چلنے کے باوجود صرف گرم ہوا ہی نہیں، بلکہ ایک ایسی چرچراہٹ پیدا کر رہا تھا جو اختر کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ چارپائی پر لیٹا چھت کو مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ یہ اس کا پرانا مشغلہ تھا جب جیب خالی ہوتی اور دماغ سوالوں سے بھرا ہوتا۔

اس کی کل جمع پونجی اس کی ایم فل اردو کی ڈگری تھی، جو ایک پرانے ٹرنک میں پڑی شاید اس کی تقدیر پر ہنس رہی تھی۔ تیس سالہ اختر ایک پرائیویٹ سکول میں پڑھاتا تھا جہاں تنخواہ اتنی تھی کہ مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی خرچ ہو جاتی اور قرضوں کی فہرست لمبی ہو جاتی۔ شادی تو اب ایک خواب بن چکا تھا۔ جب بھی گھر والے ذکر کرتے، وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ موجودہ مہنگائی میں ایک فرد کی روٹی پوری کرنا مشکل ہے تو ایک نئی زندگی کا بوجھ وہ کیسے اٹھائے گا؟

''یار اختر! تم کب تک ان کتابوں اور فلسفوں میں الجھے رہو گے؟''۔ اس کے

بچپن کے دوست تحسین نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ تحسین خود ایک چھوٹا سا کاروبار کرتا تھا اور اختر کی حالت پر اسے اکثر ترس آتا تھا۔

''باہر جانے کے لیے تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں، سیونگ تمہارے پاس کچھ ہے نہیں، اب اگر تم شارٹ کٹ سے ہی امیر ہونا چاہتے ہو تو پرائز بانڈ خرید لو۔''

تحسین کا یہ جملہ اختر کی سماعتوں میں دیر تک گونجتا رہا۔ ''شارٹ کٹ''۔

یہ لفظ جتنا پرکشش تھا، اتنا ہی خطرناک بھی مگر جس کی کشتی ڈوب رہی ہو وہ تنکے کا سہارا لینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اختر نے سوچا، کیا واقعی ایک کاغذ کا ٹکڑا اس کی تقدیر بدل سکتا ہے؟ کیا وہ تمام کتابیں جو اس نے پڑھیں، وہ اسے وہ خوشی دے سکیں جو ایک انعام یا پیسہ دے سکتا تھا؟

اسی تذبذب اور ذہنی خلفشار کے دوران اختر کو ایک ایسی خبر ملی جس نے اس کے اندر سوئی ہوئی امید کو بیدار کر دیا۔ شہر کی معروف حبیب کالونی میں ایک شخص، جو سالہا سال سے دبئی میں مقیم تھا۔ وہ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں چند روز کے لیے اپنے آبائی گھر آتے تھے۔ لوگ اسے ''راو صاحب'' کے نام سے جانتے تھے۔ وہ ایک پامسٹ اور علمِ نجوم کے ماہر تھے۔ یہ مشہور تھا کہ ان کی زبان سے نکلی ہوئی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔

اختر نے پہلے تو ان باتوں کو توہم پرستی سمجھ کر جھٹلایا لیکن جب اس کے حالات نے اسے مزید دیوار سے لگایا تو اس نے سوچا کہ ایک بار مل لینے میں کیا حرج ہے؟ اس نے بڑی مشکل سے ایک شناسا کے ذریعے راو صاحب سے ملنے کا وقت لیا۔

حبس زدہ دوپہر میں جب وہ حبیب کالونی کے اس عالی شان بنگلے کے باہر پہنچا تو وہاں لوگوں کا تانتا بندھا تھا۔ کوئی اپنی بیٹی کے رشتے کے لیے پریشان تھا تو کوئی مقدمات سے نجات چاہتا تھا۔ اختر کو اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے دو گھنٹے گزر گئے۔ آخر کار اسے اندر بلایا گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے ایک عجیب سی خوشبو کا احساس ہوا۔ سامنے ایک باوقار شخص سفید رنگ کے کپڑوں میں بیٹھے تھے جن کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ راو صاحب نے اختر کا ہاتھ دیکھا، کچھ حساب کتاب لگایا اور لمبی خاموشی اختیار کر لی۔

''تمہارے ستارے ابھی گردش میں ہیں بیٹے،'' انھوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''فی الحال تمہارے حالات بدلتے دکھائی نہیں

دیتے۔''

اختر کا دل ڈوبنے لگا۔ ''سر! کیا کوئی بھی راستہ نہیں ہے؟ میں بہت پریشان ہوں، میری محنت رنگ نہیں لا رہی۔''

راو صاحب نے اسے غور سے دیکھا، جیسے اس کی روح کے اندر جھانک رہے ہوں۔ ''پرائز بانڈ تمہارے حالات بدل سکتا ہے''۔ انھوں نے اچانک کہا۔

اختر کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ''مگر کیسے؟ میں نے تو سنا ہے کہ یہ محض اتفاق ہوتا ہے۔''

''اتفاق بھی ایک ترتیب کا نام ہے،'' راو صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تمھیں ایک نمبر دوں گا۔ امید ہے کہ اس پہ تمہارا بڑا انعام لگے گا۔ تم نے کرنا صرف یہ ہے کہ اس نمبر کی تلاش کرنی ہے۔''

اختر کی بے چینی دیدنی تھی۔ ''جی جی، میں تلاش کرلوں گا۔ آپ مجھے بس نمبر بتایئے!''

راو صاحب نے ایک کھلا رجسٹر نکالا اور اس پر کچھ ہندسے لکھنے لگے۔ وہ کچھ لکھتے، پھر کاٹتے، پھر انگلیوں کی پوروں پر کچھ گنتے۔ کمرے میں موجود گھڑی کی ٹک ٹک اختر کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ مقابلہ کر رہی تھی۔ آخر کار، انہوں نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر چھ ہندسوں کا ایک نمبر لکھا اور اختر کی طرف بڑھا دیا۔

''اس نمبر پر تمہارا سب سے بڑا انعام لگے گا۔ یاد رکھو، یہ نمبر تمہاری زندگی کا سب سے بڑا امتحان بھی ہو سکتا ہے۔''

اختر نے کاغذ تھاما۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کاغذ میں اس کی پوری زندگی کی خوشیاں مقید ہیں۔

''جی، میں ضرور یہ نمبر حاصل کرلوں گا اور انعام لگنے کے بعد سب سے پہلے آپ کے پاس آؤں گا۔''

وہ وہاں سے نکلا تو اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کی غربت کے دن گنے جا چکے ہیں۔

اگلی صبح اختر کے لیے ایک نئی زندگی کا آغاز تھی۔ اس نے اپنی جمع پونجی اکٹھی کی اور سیدھا نیشنل سیونگ سینٹر جا پہنچا۔ اسے لگا تھا کہ بینک جاتے ہی وہ نمبر اسے مل جائے گا اور وہ فاتح بن کر گھر لوٹے گا۔

بینک کے کاؤنٹر پر موجود ملازم نے جب اختر کی پرجوش آواز میں مطلوبہ نمبر سنا تو اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''بھائی صاحب، ہمارے پاس سیریل میں بانڈ آتے ہیں۔ آپ جو نمبر مانگ رہے ہیں، وہ اس سیریل میں نہیں ہے جو آج ہمارے پاس موجود ہے۔''

''لیکن مجھے یہی نمبر چاہیے'' ۔اختر نے اصرار کیا۔

''معذرت، ہم آپ کو اپنی مرضی کا نمبر نہیں دے سکتے۔ جو سٹاک میں موجود ہے، وہی ملے گا۔''

اختر مایوس نہیں ہوا۔ اسے لگا، شاید یہ بڑی کامیابی کے لیے چھوٹی سی آزمائش ہے۔ اس نے اگلے دن ضلع کی بڑی برانچ میں جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں بھی وہی صورتحال تھی۔ رش، گرمی اور پھر وہی جواب: ''یہ نمبر ہمارے پاس نہیں ہے۔''

وہ سارا دن بھوکا پیاسا ایک بینک سے دوسرے بینک پھرتا رہا۔ ضلع ہونے کی وجہ سے یہاں دو برانچز تھیں۔ اسے لگا، شاید قسمت اسے آزما رہی ہے۔ اس کے ذہن میں راو صاحب کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''کرنا صرف یہ ہے کہ اس نمبر کی تلاش کرنی ہے''۔

اب یہ تلاش ایک جنون بنتی جا رہی تھی۔ اسے ہر جگہ وہی نمبر دکھائی دیتا۔ رات کو سوتے ہوئے خوابوں میں بھی وہی چھ ہندسے رقص کرتے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ چاہے اسے ملک کے آخری کونے تک جانا پڑے، وہ یہ بانڈ حاصل کر کے رہے گا۔ ضلعی برانچز سے ناکام واپسی کے بعد اختر کی حالت ایک ایسے مسافر کی سی تھی جو ریگستان میں سراب کے پیچھے بھاگ رہا ہو۔ اس کے پاس موجود رقم اب سفر کے اخراجات کی نذر ہو رہی تھی، لیکن اس کے دماغ پر سوار جنون اسے رکنے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر چھوٹے شہروں میں یہ نمبر نہیں ہے تو یقیناً ڈویژنل ہیڈ کوارٹر یا کسی بڑے تجارتی مرکز کے بینکوں میں موجود ہوگا۔

اگلی صبح وہ ایک لمبا سفر طے کر کے بڑے شہر پہنچا۔ وہاں کی رونقیں اور بلند و بالا عمارات بھی اسے مرعوب نہ کر سکیں، اس لیے کہ اس کی نظریں صرف بینکوں کے سائن بورڈز تلاش کر رہی تھیں۔ ایک بڑے نجی بینک کے منیجر نے تمام صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد اس کی پریشانی دیکھی تو اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

''بیٹے! تم اس ایک نمبر کے لیے کیوں ہلکان ہو رہے ہو؟'' منیجر نے ہمدردی سے پوچھا۔

''دیکھو، ہمارے پاس ہزاروں بانڈز موجود ہیں۔ تم ان میں سے جتنے چاہو، لے لو۔ مقدر میں ہوا تو انعام نکل آئے گا۔ یہ نمبروں کا پیچھا کرنا صرف وقت کا زیاں ہے۔''

اختر کے پاس اس کے سوال کا کوئی منطقی جواب نہیں تھا۔ وہ کیا بتاتا کہ اس کاغذ کے

پرزے پر لکھی ہوئی تحریر اس کے لیے الہامی درجہ رکھتی ہے؟- وہ خاموش رہا اور وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا- اسے لوگوں کی ہمدردی سے زیادہ اس نمبر کی ضرورت تھی-

اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ آخری کوشش کے طور پر صوبائی دارالحکومت کے مرکزی بینک (State Bank) جائے گا- وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہاں سے بھی بانڈ نہ ملا، تو پھر کہیں سے نہیں ملے گا- وہ صوبے کے بڑے شہر پہنچا- اس کے پاس اتنے اضافی پیسے نہیں تھے کہ کسی ہوٹل میں رکتا- چنانچہ اس نے رات ریلوے اسٹیشن کے بینچ پر گزاری- مچھروں کے کاٹنے اور شور وغل کے باوجود اسے نیند نہیں آ رہی تھی- اس کے ہاتھ میں موجود وہ پرچی جس پر پامسٹ نے نمبر لکھا تھا، اب پسینے اور بار بار چھونے سے میلی ہو چکی تھی مگر اسے پرواہ نہیں تھی، اس لیے کہ اس کے ہندسے اختر کے دل پر نقش تھے-

مرکزی بینک کی عمارت کسی قلعے کی مانند کھڑی تھی- اختر جب اندر داخل ہوا تو وہاں کا نظم وضبط اور رش دیکھ کر دنگ رہ گیا- وہ کئی گھنٹوں تک مختلف کاؤنٹرز پر دھکے کھاتا رہا- آخر کار وہ اس ڈیسک تک پہنچا جہاں پرائز بانڈز کی انوینٹری کا ریکارڈ موجود تھا-

وہاں بیٹھے معمر کلرک نے کمپیوٹر پر کچھ دیر سرچ کرنے کے بعد سر جھٹکا-

''نہیں بھائی، یہ سیریل اور یہ نمبر اس وقت ہمارے کسی بھی سٹاک میں نہیں ہے- یہ شاید بہت پہلے کسی دوسری برانچ کو جاری ہو چکا ہے- ممکن ہے کسی شہری نے اسے خرید کر اپنے پاس رکھا ہوا ہو-''

اختر کو لگا جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو-

''سر! کیا کوئی بھی طریقہ نہیں ہے، کسی طرح یہ بانڈ مل جائے؟'' اس کی آواز رندھ گئی تھی-

کلرک نے تجربہ کار نظروں سے اختر کے چہرے پر پھیلی زردی اور آنکھوں کے گرد حلقوں کو دیکھا- وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی عام خریدار نہیں بل کہ ''امید کا مارا ہوا'' ایک شکاری ہے- اس نے دھیمے لہجے میں کہا-

''دیکھو نوجوان! تم یہاں وقت ضائع کر رہے ہو- اگر یہ بانڈ کسی بینک کے پاس نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ مارکیٹ میں گردش کر رہا ہے- تم ایسا کرو، بینک کے باہر جو پرائز بانڈز کے بروکرز اور ڈیلرز بیٹھے ہیں، ان سے رابطہ کرو- وہ لوگ پرانے بانڈز بھی رکھتے ہیں اور بعض اوقات مخصوص نمبروں کا تبادلہ بھی کرتے ہیں لیکن یاد رکھنا،

وہ تم سے اس کی اصل قیمت سے زیادہ پیسے مانگیں گے۔"

اختر کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ایک بار پھر زندگی کی رمق جاگی۔ اس نے کلرک کا شکریہ ادا کیا اور باہر کی طرف دوڑا۔

بینک کے باہر فٹ پاتھ پر چھتریاں لگائے قطار در قطار بروکرز بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے شیشے کے ڈبوں میں ہزاروں کی تعداد میں نئے اور پرانے بانڈز سجے ہوئے تھے۔ اختر ایک ایک کے پاس گیا۔ وہ اپنا نمبر بتاتا، بروکر اپنے ریکارڈ دیکھتا اور سر ہلا دیتا۔

"صاحب! یہ نمبر تو بہت 'ہاٹ' والا لگ رہا ہے۔ کیا کوئی خاص بات ہے اس میں؟"۔ ایک چالاک بروکر نے پوچھا۔

"نہیں، بس میرا لکی نمبر ہے۔" اختر نے بوکھلا کر جواب دیا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر کسی کو شک ہوگیا تو وہ اسے کبھی نہیں ملے گا۔

سارا دن گزر گیا۔ سورج ڈھلنے لگا اور بازار کی روشنیاں آن ہوگئیں۔ اختر کے جوتے گھس چکے تھے اور اس کی ہمت بھی جواب دے رہی تھی۔ اس نے شہر کے سب سے بڑے ڈیلر کے پاس جا کر آخری بار اپنا نمبر دہرایا۔

ڈیلر نے اپنی عینک ٹھیک کی اور ایک موٹا سا رجسٹر کھولا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "ہاں، یہ بانڈ میرے پاس تین دن پہلے تک موجود تھا، لیکن پرسوں ہی ایک صاحب اسے لے گئے ہیں۔ انھوں نے پوری سیریل مانگی تھی اور یہ نمبر اسی میں چلا گیا۔"

اختر کا جی چاہا کہ وہ وہیں چیخ مار کر رو دے۔ وہ صرف دو دن کی تاخیر سے پہنچا تھا۔ اس نے اس شخص کا پتہ پوچھنا چاہا جس نے وہ بانڈ خریدا تھا لیکن ڈیلر نے معذرت کر لی کہ وہ اپنے گاہکوں کی تفصیلات ظاہر نہیں کر سکتے۔

اختر ٹوٹ چکا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ پامسٹ نے سچ کہا تھا کہ "یہ نمبر تمہارا امتحان بھی ہوسکتا ہے"۔ وہ ہار گیا تھا۔ وہ خالی جیب اور خالی ہاتھ اپنے شہر کی طرف لوٹنے والی بس میں بیٹھ گیا۔ پورے راستے وہ یہی سوچتا رہا کہ شاید اس کی قسمت میں صرف یہ جاننا لکھا تھا کہ وہ امیر ہو سکتا ہے مگر ہونا اس کے مقدر میں نہیں تھا۔

واپس آ کر اختر کئی روز تک گم سم رہا۔ اس نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ لوگ اسے پاگل سمجھنے لگے تھے۔ پھر وہ دن بھی آ گیا۔ جب پرائز بانڈ کی قرعہ اندازی ہونا تھی۔ اس رات وہ سو نہ سکا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کائنات کا سارا نظام اس کے

خلاف سازش کر رہا ہے۔

اگلی صبح وہ اخبار آنے سے پہلے ہی شہر کی مرکزی لائبریری پہنچ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہاں تمام بڑے اخبارات سب سے پہلے آتے ہیں۔ لائبریری کے برآمدے میں اخبارات کا پلندہ آیا تو اس نے لرزتے ہاتھوں سے وہ اخبار اٹھایا جس میں قرعہ اندازی کے نتائج درج تھے۔

اس کے دل کی دھڑکنیں اس کے کانوں میں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے صفحہ پلٹا۔ جلی حروف میں ''پہلا انعام'' لکھا ہوا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر پہلے انعام کے نمبر پر پڑی، اس کے ہاتھ سے اخبار چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ اس نے آنکھوں کو مل کر دوبارہ دیکھا۔

وہی نمبر۔۔ بالکل وہی چھ ہندسے جو اس میلی کچیلی پرچی پر لکھے ہوئے تھے۔

پامسٹ کی پیشگوئی سو فیصد درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ نمبر جس کی تلاش میں اس نے اتنی خاک چھانی تھی، وہی کروڑوں روپے کے انعام کا حقدار ٹھہرا تھا۔ اختر کو اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا محسوس ہوا۔ اسے وہ تمام بینک، تمام بروکرز اور وہ مخصوص ڈیلر یاد آنے لگا جس نے کہا تھا کہ ''دو دن پہلے یہ بانڈ بک گیا ہے''۔

اسے ایسا لگا جیسے قسمت اس کے سامنے کھڑی قہقہے لگا رہی ہے۔ اسے یہ تو معلوم ہو گیا کہ خزانہ کہاں ہے مگر وہ اس کی چابی حاصل نہ کر سکا تھا۔ یہ دکھ انعام نہ نکلنے کے دکھ سے کہیں بڑا تھا۔ اس کے اعصاب اس بوجھ کو برداشت نہ کر سکے۔

''ہائے میری قسمت۔۔۔'' اس کے حلق سے ایک گھٹی ہوئی آواز نکلی اور وہ وہیں اخبارات کے ڈھیر پر لڑھک گیا۔

آس پاس موجود لوگ اسے اٹھانے کے لیے دوڑے، کوئی پانی لایا تو کوئی اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ شخص کسی بیماری سے نہیں بل کہ ''مقدر'' سے ہارا ہے۔ اختر کی آنکھیں کھلی تھیں، جن میں وہ اخبار کا صفحہ اب بھی عکس کی طرح موجود تھا مگر ان آنکھوں کی چمک ہمیشہ کے لیے بجھ چکی تھی۔ وہ ایک ایسے انعام کا قیدی بن گیا تھا جو اس کا ہو کر بھی اس کا نہ ہو سکا۔

اختر انسانی بے بسی کی مکمل تصویر تھا۔ وہ تقدیر کے ہاتھوں ہار گیا تھا۔ اس لیے کہ محض ''علم'' انسان کو کامیاب نہیں بناتا جب تک ''نصیب'' اس کا ساتھ نہ دے۔

☆☆☆☆☆

نورِ عکس

نورِ نجف

بارش مسلسل برس رہی تھی بادل یوں اُمڈ اُمڈ کر آ رہے تھے جیسے برسوں کوئی ہجر کا مارا اچانک رونما ہو جانے والے وصل کی شادمانی کو برداشت نہ کر پایا ہو اور بلک بلک کر رو رہا ہو۔ نم مٹی کی خوشبو روحی کے کمرے میں بھی درازوں سے گزرتی ہوئی داخل ہو رہی تھی۔ روحِ نُور جسے اُس کے بابا پیار سے روحی کہہ کر پکارتے تھے، بارش کی دیوانی تھی۔ کئی ہفتے ہو چکے تھے، وہ ایک عجیب کیفیت کا شکار تھی۔ کھڑکی کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر بوجھل آنکھوں سے وہ بارش کی بوندوں کا زمین سے وصل دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں ایک ہی سوال بجلی کے کوندے کی طرح آتا اور اس کے ذہن و دل کی دنیا کو زیر و زبر کر کے رکھ دیتا، اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنا شروع ہو جاتا اور پھر اسے کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ وہ سوچتی: ”انسان کے اندر ایسا کون سا گوشہ ہے جو ہر بات، ہر رشتے اور ہر صدا کے باوجود خالی ہی رہتا ہے؟“

ماں کی محبت، باپ کا دوستانہ رویہ، دوستوں کا بے تکلفانہ انداز، ان کی بات بات پر ہنسنے کی ادا، کلاس میں سب سے یونیک لڑکی کا خطاب، کوئی اسے موڈی کہتا تو کوئی اس کی ہر وقت کام آنے کی خوبی کو سراہتا۔ سب کچھ اپنی جگہ اس کا نصیب تھا لیکن اس سب کے باوجود اس کے دل کی دنیا پر ویرانی کا پہرہ تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ شروع سے ایسی ہو، چند ماہ پہلے تک وہ ہنستی تھی، ہر ایک سے بات کرتی تھی، خواب دیکھتی تھی اور ”خواب تعبیر کا رنگ پاتے تھے۔“ والا معاملہ تھا لیکن اب ---

اب وہ اپنے اندر پھیلتی خاموشی سے ڈرنے لگی تھی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ اسے کسی سے بات کرنی چاہیے مگر ہر بار اسے یوں لگتا جیسے الفاظ اس کی زبان سے پھسل کر زمین بوس ہو جائیں گے۔ بے معنی، بے جان،

بوجھ - کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھی روحی سوچتے سوچتے اچانک چونکی- پاس پڑی میز سے قلم اور ڈائری اٹھائی، ڈائری کو کھولا، کئی صفحات خالی تھے- وہی خالی پن کئی دنوں سے اس کا منہ بھی چڑا رہا تھا- اس نے معمول کی طرح لکھنا شروع کیا جیسے کوئی اس سے لکھوا رہا ہو-

''آوازیں بہت ہیں میرے اندر لیکن میری نہیں—، زندگی جی رہی ہوں لیکن مانگی ہوئی یوں لگتا ہے جیسے میرے اندر کوئی اور جی رہا ہو- کاش میں اپنے اندر چاروں اور پھیلے اس سناٹے سے ہمکلام ہو سکتی، کوئی بتائے مجھے کہ میں کیوں کھو گئی ہوں؟''

پھر ایک حیرت انگیز بات ہوئی، اگلے دن اس نے دیکھا کہ جس صفحے پر وہ رکی تھی اس کے نیچے ایک سطر کسی ان دیکھے لیکن مانوس ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی- مانوس بھی اس نے تب سوچا کیونکہ وہ سطر پڑھتے ہوئے اسے اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تھا: ''اپنے اندر کے شور میں دبے سچ کو سنو- تمھاری ہی صدا تمھارے اندر کہیں موجود ہے-'' روحی چونک گئی- کمرے کا دروازہ بند تھا- اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے مخاطب کیا ہو، یہ تحریر اس کی چیخ کے جواب میں تھی- دو دن تک وہ بے چینی کا شکار رہی- تیسرے دن اس نے ڈائری کھول کر دیکھا- پھر بوجھل آنکھوں سے دیکھتے ہوئے تشنہ لبوں سے سوال کیا: ''کون ہو تم؟'' کوئی جواب نہ آیا-

اگلے دن اس نے پھر خالی صفحے پر لکھا: ''اگر تم نے مجھے سن لیا ہے تو سمجھا بھی دو- میں اپنے اندر کی تاریکی سے بہت ڈرتی ہو، میں خالی کیوں ہو گئی ہوں؟ سامنے آؤ-'' لہجہ مجنونانہ ہو گیا تھا-

اگلے دن وہ اپنے دادا کی قبر پہ گئی- سخی نور محمدؒ، لال شہباز قلندرؒ کے سلسلے کے فرد تھے- انہیں دنیا سے رخصت ہوئے سولہ برس بیت چکے تھے- وہ چونک گئی- ایک نوجوان مزار کے احاطے میں کھڑا تھا، وہ ماں کے ساتھ آئی تھی -اس نے روحی کی طرف دیکھا، مسکرایا- حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ نوجوان ہو بہو اس کے دادا کے جیسا تھا- وہ بولا تو لہجے میں شیرینی گھلی تھی: ''جو خود کو خالی سمجھتا ہے وہی بھرا ہوا ہوتا ہے اس کی

توحید کی معرفت سے۔''

روحی کو ایک جملہ یاد آ گیا: ''خالی وہ ہوتا ہے جسے اپنی اصل ملنے والی ہو۔'' کبھی اسے یوں لگتا کہ کوئی اس کے گھر آتا ہے یا پھر وہ خود ہی نیند میں لکھ دیتی ہے۔ لیکن تحریر اجنبی ہوتی تھی۔ دن گزرتے گئے، ڈائری اس کا سہارا بن گئی۔ وہ اپنی الجھنیں ڈائری پر لکھتی اور اگلے دن اسے جواب مل جاتا۔

''میں خود کو کھو رہی ہوں۔''

''پہلے خود کو پہچانو، پھر وہ بھی تمھاری سمجھ میں آجائے گا۔''

''زندگی بے معنی لگنے لگی ہے مجھے۔''

''کیونکہ تم روشنی کو نہیں پہچانتی اور اندھیرے کو دیکھتی ہو۔''

''لوگ مجھے نہیں سمجھتے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے، بجائے اس کے کہ لوگ تمھیں سمجھیں تم خود کو سمجھو، اپنے آپ کو پہچانو۔''

اسے یوں لگا جواب دینے والا اس کے اندر بیٹھا ہے۔

مکیں کے لیے مکان تیار کرایا جا رہا تھا۔

روحی بدلنے لگی۔ اس کا لہجہ نرم ہو گیا آنکھوں میں خوف کے بجائے امید کا دیا جلنے اور پھر چمکنے لگا۔ وہ خود کو جاننے لگی اور اپنی ذات کے دھاگوں کو آہستہ آہستہ سلجھانے لگی۔

ایک دن آیا: کوئی اس کے اندر بولا: ''کون ہو تم؟'' وہ ہنس دی، ادائے دلبری سے کہنے لگی: ''مجھے نہیں پتا، خود بتا دو۔'' اچانک ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔

اگلی صبح اس نے ڈائری کھولی، جواب وہاں نہیں تھا۔ اس نے بے تابی سے لیکن کسی قدر وحشت سے صفحے پلٹے۔ آخری صفحے پر اس کی نظریں جم گئیں۔ اسے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ لکھا تھا:

''میں تم سے جدا نہیں ہوں، وہی ہوں جسے تم تلاشتی رہیں۔ نور کا نور۔۔۔ جس کا تم عکس ہو۔۔ تمھارے اندر صدا بن کر جو گونجتا رہا لیکن تم نے اس صدا کو سنا نہیں۔ وہ صدا جو ،ان بیتے سولہ برسوں میں ایک لمحے کو بھی تم سے جدا نہیں ہوئی۔۔۔۔۔

تم کون ہو ۔۔۔۔۔ تم عکسِ نور ہو عکسِ نوووووووووووور۔''

☆☆☆☆☆

سراب

محمد علی نجیب

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب مریم دفتر سے واپسی کے لیے ایک کھچا کھچ بھری ویگن میں سوار ہوئی۔ اسے پچھلی نشست پر جگہ ملی، جہاں اس کے عین سامنے ایک میلے کچیلے حلیے والا لڑکا بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں مسلسل مریم کے چہرے اور جسم پر جمی ہوئی تھیں، جن میں ایک عجیب سی ہوس اور بے باکی تھی۔

مریم نے بار بار اپنی چادر کو درست کیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی، لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شخص اپنی نظروں سے اسے نوچ رہا ہے۔

اسی ویگن میں مریم کے برابر والی سیٹ پر ایک سنجیدہ اور سلجھے ہوئے حلیے کا نوجوان بیٹھا تھا، جس کا نام روحان تھا۔ روحان نے جب محسوس کیا کہ وہ اوباش لڑکا لڑکی کو ہراساں کر رہا ہے، تو اس نے خاموشی سے اپنی جگہ بدل لی اور اس لڑکے اور مریم کے درمیان حائل ہو گیا۔ اس کی پشت اب اس لڑکے کی طرف تھی، جس سے مریم کو تھوڑا سکون ملا۔

جب مریم کا سٹاپ آیا تو شام کے سائے لہرا

رہے تھے۔ مریم کے ویگن سے اُترتے ہی وہ اوباش لڑکا بھی ویگن سے اتر گیا اور مریم کا پیچھا کرنے لگا۔ مریم کے قدم ڈگمگانے لگے، لیکن تبھی اسے پیچھے سے ایک مردانہ آواز آئی۔

''جی آپ پریشان نہ ہوں، میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔''

یہ روحان تھا۔ اس نے نہ صرف اس پیچھا کرنے والے لڑکے کو گھور کر وہاں سے بھگایا بل کہ بہت تمیز سے مریم کے ساتھ اس کے گھر کی گلی تک چلنے لگا۔

راستے بھر اس نے نہ تو کوئی بات کی اور نہ ہی مریم کو غیر محفوظ محسوس ہونے دیا۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر مریم نے ایک گہرا سانس لیا۔ اخلاقاً ایک دوسرے کا نام جاننے کے بعد مریم کے دل میں اس اجنبی کے لیے عزت اور تشکر کا ایک عجیب جذبہ پیدا ہوا۔ اسے ایسا لگا کہ آج کے دور میں جہاں قدم قدم پر درندگی ہے، وہاں روحان جیسے انسان کا ملنا کسی معجزے سے کم نہیں۔

جب روحان نے رخصت چاہی، تو مریم نے اسے ایک پل کے لیے روکا۔ اس کے ذہن میں احسان مندی کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ اسے محض ''شکریہ'' کہہ کر رخصت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے روحان کو گھر کے اندر آ کر چائے پینے کا اصرار کیا اور روحان کو اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گئی۔

مریم کا دل دھڑک رہا تھا، لیکن یہ گھبراہٹ نہیں بل کہ ایک عجیب سا اطمینان تھا جو اس کے وجود میں اُترا ہوا تھا۔ گھر کی پُرسکون فضا میں ایک اجنبی کی موجودگی سے مریم نے پہلی بار کسی انجانے مرد کے ساتھ خود کو اتنا محفوظ محسوس کیا تھا۔ گھر میں داخل ہو کر برآمدے سے گزرتے ہوئے مریم روحان کے ساتھ اپنی ماں کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مریم کی بوڑھی ماں نے حیرت، فکرمندی اور سوالیہ نظروں سے اسے پھر روحان کو دیکھا، اور ساتھ ہی کمرے میں موجود دو معصوم بچے، جن کی عمریں چھ اور سات سال تھیں، اپنی ماں کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر متجسس ہوئے۔ مریم نے سنجیدگی سے ماں کو مخاطب کیا، ''امی، یہ روحان ہیں۔ آج اگر یہ نہ ہوتے تو شاید میں سے گھر نہ پہنچ پاتی۔ روحان یہ میری والدہ اور میرے دو بیٹے ہیں۔ مریم روحان سے اپنی فیملی کا تعارف کرواتے ہوئے دوبارہ ماں سے مخاطب ہوئی۔ امی راستے میں ایک شخص مجھے ہراساں کر رہا تھا اور میرا پیچھا کر رہا تھا، مگر روحان نے اس اوباش آدمی کو نہ صرف بھگایا بل کہ مجھے گھر تک بھی

بحفاظت چھوڑنے آئے۔

یہ سننا تھا کہ بوڑھی ماں کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ انھوں نے روحان کی طرف شکریہ ادا کرتے ہوئے ایسے دیکھا جیسے وہ کوئی فرشتہ ہو جوان کے گھرانے کی عزت بچا کر لایا تھا۔

روحان، جواب تک بہت وقار اور شرم و حیا کے ساتھ نظریں جھکائے کھڑا تھا، نے مریم کی ماں کے سامنے سر جھکا کر سلام کیا اور عاجزی سے بولا، ''خالہ، یہ تو میرا فرض تھا۔ میری جگہ کوئی بھی باشعور انسان ہوتا تو وہ یہی کرتا۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، بس میری خوشی یہی ہے کہ مریم خیریت سے اپنے گھر پہنچ گئیں۔''

روحان کی باتیں سن کر مریم کی ماں اسے دعا دیتے ہوئے بولی۔ بیٹا ایسے موقعوں پر اپنے داماد کے اس دنیا سے جلدی جانے کا احساس ہوتا ہے۔ جبکہ مریم نے یہ سنتے ہوئے اپنی ماں کو ٹوکا۔ امی آپ بھی کی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ موقع تو دیکھ لیں۔ ایسا کہتے ہوئے وہ روحان کو گھر کے ڈرائنگ میں بٹھا کر کچن میں جا کر چائے بنانے لگی۔ جب وہ چائے لے کر آئی، تو ڈرائنگ روم میں اس کے دونوں بچے بھی آ چکے تھے اور روحان نے بچوں کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ کمرے میں بچوں کے میٹھے قہقہے گونج رہے تھے۔ اپنے بچوں کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر مریم کے دل میں اس شخص کے لیے عزت مزید بڑھ گئی۔

چائے پیتے ہوئے روحان نے مریم کی طرف دیکھا اور نرمی سے کہا، ''مریم، بہت افسوس ہوا آپ کے شوہر کا سن کر۔ بس جو اللہ کی مرضی میں اس پر صبر کرتی ہوں۔ مریم نے روہانسا ہوتے ہوئے جواب دیا۔

روحان نے بات کو بڑھایا۔ مریم، دنیا میں برائی ضرور ہے، لیکن ایسے واقعات آپ کا حوصلہ پست نہ کریں۔ آج جو ہوا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ باہر نکلنا چھوڑ دیں۔ بس اپنے اردگرد کے لوگوں پر نظر رکھیں۔

روحان کی باتیں سنتے مریم نے دونوں بچوں کو اپنی ماں کے کمرے کی طرف بھیجا اور خود روحان کے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ڈرائنگ روم میں ایک خاموش اور پُرسکون ماحول پیدا ہو گیا۔

مریم نے روحان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آج وہ تھکن نہیں تھی جو دفتر سے واپسی پر ہوتی تھی، بل کہ ایک ایسی چمک تھی جس میں تشکر بھی تھا اور کچھ گہری خواہشات بھی۔ وہ اکیلی عورت ہونے کے طور پر زندگی کی تلخ حقیقتوں اور تنہائی کے بوجھ سے

بخوبی واقف تھی۔ معاشرے کی نظروں میں اس کی حیثیت ایک ایسی عورت کی تھی جسے ہر لمحہ اپنی حفاظت کرنی پڑتی تھی، اور اس تنہائی میں اسے ایک ایسے مضبوط سہارے کی تلاش تھی جس کے سائے میں وہ خود کو مکمل محسوس کر سکے۔ روحان، جو اپنی فطری شرافت کی وجہ سے نظریں نیچی رکھے ہوئے تھا، مریم کی اس بدلتی ہوئی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔ مریم نے ذرا جھک کر نرم اور دھیمی آواز میں بات شروع کی۔ روحان، آپ نے آج جو کیا، وہ صرف آپ کی معمولی مدد نہیں تھی۔ آپ نے ایک عورت کو یہ احساس دلایا ہے کہ دنیا میں شرافت ابھی ختم نہیں ہوئی۔'' مریم نے بات جاری رکھی، اس کی آواز میں ایک ایسی کشش تھی جو روحان کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اس تنہا زندگی میں جہاں ہر شخص اپنی غرض کے پیچھے بھاگ رہا ہے، آپ کا کردار مجھے بہت مختلف لگا۔ ایک ایسا انسان جس پر بھروسہ کیا جا سکے، آج کے دور میں نایاب ہے۔ مریم نے اپنی نشست کچھ اس طرح بڑھائی کہ وہ روحان کے مزید قریب ہو گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں سیدھا دیکھ کر گویا ہوئی۔ عورت ہونے کے ناطے میں جانتی ہوں کہ دنیا مجھ سے کیا توقع رکھتی ہے، لیکن میں بھی سکون اور عزت کی متلاشی ہوں۔ مجھے آج آپ میں وہ تحفظ نظر آیا جس کی میں منتظر تھی۔ روحان نے سر اُٹھا کر مریم کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیا کے ساتھ ساتھ ایک گہری سنجیدگی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مریم اسے محض ایک اجنبی کے طور پر نہیں، بل کہ اپنے مستقبل کے ایک اہم حصے کے طور پر دیکھ رہی ہے۔ مریم کی یہ بے باک مگر مہذب کشش روحان کے دل پر اثر کر رہی تھی۔ روحان ایک ایسا مرد تھا جو عورت کی عزت کرنا جانتا تھا، اور مریم کی یہ کمزوری اسے اپنے قریب کر رہی تھی۔ مریم نے آہستگی سے میز پر رکھے چائے کا کپ اُٹھایا اور پھر روحان کی طرف بڑھایا، ''میں نے آپ کو یہاں صرف شکریہ ادا کرنے کے لیے نہیں بلایا، میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا آپ کی زندگی میں ایسی جگہ ہے جہاں آپ کسی کے لیے اپنا وقت، اپنا تحفظ اور وجود بانٹ سکیں؟ کیونکہ مجھے اب کسی ایسے ہی انسان کی ضرورت ہے۔ مریم کی باتیں سن کر روحان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے اضطراب کی لہر دوڑی۔ وہ شریف انسان تھا اور مریم کی تنہائی اور اس کی مجبوری کو بخوبی سمجھ رہا تھا، لیکن اس کی اپنی زندگی کی ترجیحات اور اصول مختلف تھے۔ وہ ایک کنوارا نوجوان

تھا، جس کے خوابوں میں شاید زندگی کا ایک الگ سفر تھا، اور وہ مریم کے اس جذباتی دباؤ کو محسوس کر کے اندر سے کانپ اُٹھا۔ اس نے بہت نفاست اور نرمی سے، مریم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، ”مریم، آپ کی عزت میرے دل میں بہت زیادہ ہے اور آج جو میں نے کیا، وہ میری انسانی ذمہ داری تھی۔ لیکن آپ کا یہ اعتماد مجھے بہت گہرائی سے چھو گیا، مگر میں شاید وہ نہیں ہوں، جس کی آپ تلاش کر رہی ہیں۔ میری زندگی کی راہیں کچھ اور ہیں۔ مریم، جو تنہائی کے لمبے عرصے سے تھک چکی تھی اور روحان کے وجود میں اپنا سکون تلاش کر رہی تھی، اس انکار کو برداشت نہ کر سکی۔ اس کے اندر دبا ہوا جذبات کا طوفان اُمڈ آیا۔ وہ ایک بیوہ تھی، جس کی زندگی معاشرے کی سرد مہری کے بیچ ایک ویران جزیرہ بن چکی تھی۔ روحان کی موجودگی، اس کا تحفظ اور اس کی شرافت نے مریم کو ایک ایسے سراب میں مبتلا کر دیا تھا، جہاں اسے لگ رہا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا آخری سہارا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے جذباتی طور پر مغلوب ہو کر روحان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ خود کو روک نہ پائی اور کسی قسم کی ہچکچاہٹ کو ایک طرف رکھتے ہوئے، اس نے اپنی انا، عزت اور معاشرتی بندھنوں کو توڑتے ہوئے روحان کے سامنے خود کو پیش کر دیا۔

روحان، آپ کو اندازہ نہیں کہ اس تنہائی میں کتنا کرب ہے۔ میں تھک چکی ہوں، مجھے صرف تحفظ نہیں، زندگی کے لیے ایک رفاقت چاہیے۔ میرا گھر، یہ بچے، یہ سب کچھ آپ کا ہو سکتا ہے۔ مجھے صرف آپ کی پناہ چاہیے۔ اس کے الفاظ میں ایک عجیب سی تڑپ تھی، ایک ایسی پکار جو کسی بھی مرد کے لیے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ ڈرائنگ روم میں پن ڈراپ سائلنس تھا، صرف مریم کے بھاری سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ روحان ایک لمحے کے لیے سکتے میں آ گیا۔ اس کے سامنے ایک ایسی عورت تھی جس نے اپنی عزت نفس کو ایک طرف رکھ کر اسے اپنا سب کچھ سونپ دیا تھا۔ روحان کے لیے صورتحال انتہائی مشکل تھی۔ ایک طرف اس کی اپنی زندگی کے اصول تھے اور دوسری طرف مریم کی بے پناہ جذباتی کیفیت، جو شاید کسی گہرے صدمے اور تنہائی کا نتیجہ تھی۔ وہ وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا، لیکن مریم کی گرفت اور اس کی آنکھوں کی التجا نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ کمرے کی فضا بوجھل ہو گئی۔ مریم کا یہ اقدام روحان کے لیے کسی جھٹکے سے کم نہ تھا۔ وہ جس

شرافت اور وقار کے ساتھ اس گھر میں داخل ہوا تھا، مریم کا یہ رویہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ روحان کے ذہن میں وہ لمحہ تازہ ہو گیا جب کچھ ہی دیر پہلے وہ اسی عورت کو ایک اوباش کی ہوس بھری نظروں سے بچا کر لایا تھا۔ آج خود اسی عورت کے ہاتھوں اپنی غیرت اور اصولوں کی آزمائش میں تھا۔ مریم کی یہ بے تابی، جو دراصل اس کی طویل تنہائی اور جذباتی محرومی کا نتیجہ تھی، روحان کے لیے کسی آزمائش سے کم نہ تھی۔ روحان پیچھے ہٹا، اس نے مریم کا ہاتھ جھٹک دیا، مگر بہت ہی تحمل اور متانت کے ساتھ۔ اس کی نظروں میں غصہ نہیں، بل کہ ایک گہری ہمدردی اور کرب تھا۔ مریم! روحان کی آواز گونجی، جس میں ایک ٹھہراؤ اور وقار تھا۔ ''آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے جس چیز کی حفاظت کی تھی، ابھی آپ خود اسے اتنی ارزاں کر رہی ہیں؟''

روحان نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ وہ اس لمحے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں یہاں آپ کو تحفظ دینے آیا تھا، اپنی ہوس مٹانے نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ تنہا ہیں، آپ کو ایک سہارے کی ضرورت ہے، لیکن یہ راستہ..... یہ راستہ آپ کے لیے نہیں رہے۔ یہ آپ کی عزت اور آپ کے بچوں کے مستقبل کے ساتھ کھلواڑ ہے۔ آپ کی یہ بے تابی آپ کی مجبوری کا تو ثبوت ہو سکتی ہے، لیکن یہ آپ کے وقار کی ترجمانی نہیں ہے۔ مریم، جو جذبات کے سیلاب میں بہہ گئی تھی، روحان کے ان الفاظ سے جیسے برف کی طرح پگھل گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ وہ جس روحان میں اپنا نجات دہندہ تلاش کر رہی تھی، اس کے سامنے وہ خود کو کتنا چھوٹا کر بیٹھی تھی، روحان نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا، ''مریم، آپ نے مجھے اپنا محافظ سمجھا، یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے، لیکن میں آپ کی عزت کا سودا اپنی خواہشات کے لیے کبھی نہیں کروں گا۔ آپ کو ایک ساتھی کی ضرورت ہے، کسی ایسے شخص کی نہیں جو آپ کی کمزوری کا فائدہ اُٹھائے، خود کو سنبھالیں، آپ کے بچے آپ کے منتظر ہیں۔ اس کے بعد روحان نے مزید ایک لمحہ وہاں رُکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھا مریم نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے روحان کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی گرفت میں ایک عجیب سی ضد اور التجا تھی، جس نے روحان کے قدموں کو وہیں

جما دیا۔ مریم کی آنکھوں میں اب ندامت نہیں، بل کہ ایک ایسی پیاس تھی جو اس کے سارے حجابات کو بہا لے گئی تھی۔ وہ اس کے قریب آئی، اس کی آواز میں ایک ٹھہراؤ اور مٹھاس تھی جس نے روحان کے پختہ ارادوں کو ایک لمحے میں کمزور کر دیا۔ اس نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا، ''روحان، آپ شرافت کی بات کرتے ہیں، مگر کیا شرافت کا مطلب دو تنہا روحوں کا ایک دوسرے کی پناہ بننا نہیں ہے؟ میں نے آپ میں جو تحفظ دیکھا، وہ میری مجبوری نہیں، میری چاہت ہے۔ کیا آپ مجھے صرف ایک اجنبی بنا کر چھوڑ دیں گے؟''

اس کے الفاظ اور قربت نے روحان کے اندر کے کنوارے پن اور تنہائی کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ جو اب تک اپنے اصولوں کی دیواروں کے پیچھے محفوظ تھا، مریم کے جذبات کے سامنے پگھلتا چلا گیا۔ وہ کشمکش جو چند لمحے پہلے اسے دروازے سے باہر لے جا رہی تھی، اب مریم کی نرمی اور قربت کے سامنے دم توڑ گئی۔ دونوں کے درمیان کا فاصلہ مٹ گیا اور وہ جذبات کے سیلاب میں بہتے چلے گئے۔ گھر کی اس خاموشی میں، جو اب تک بچوں اور ماں کی موجودگی سے معمور تھی، ایک ایسا لمحہ آیا جس نے دونوں کو ایک دوسرے کی پناہ گاہ بنا دیا۔ کچھ دیر بعد، جب روحان گھر سے باہر نکلا، تو رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔

وہ گلی کی خاموشی میں چلتے ہوئے اپنی شرٹ درست کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں مریم کا چہرہ اور وہ لمحات گردش کر رہے تھے۔ اچانک اس کے لبوں پر ایک کھسیانی ہنسی پھیل گئی۔ اسے آج کے معاشرتی مباحث اور وہ معروف نعرہ، ''میرا جسم میری مرضی''، یاد آیا جو اس نے اکثر اخبارات اور سوشل میڈیا پر پڑھا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ آج اس نے اس نعرے کی ایک مختلف اور عملی شکل دیکھی ہے۔ وہ ہنستے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا، ''حقیقت میں یہ سب کتنا پیچیدہ ہے، لیکن شاید اس کا نام زندگی ہے۔''

مریم کو دوبارہ ملنے کا پکا یقین دلانے اور اس کے دل میں ایک نئی امید جگانے کے بعد، روحان گلی کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔ وہ اب پہلے والا روحان نہیں تھا، اور مریم کا گھر بھی اب پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ اس رات نے ان دونوں کی زندگیوں میں ایک ایسا باب کھول دیا تھا جس کے انجام کا کسی کو اندازہ نہ تھا۔

☆☆☆☆☆

راکھ کے نیچے سانس

سردی اس برس کچھ دیر سے آئی تھی، مگر جب آئی تو یوں جیسے شہر سے کوئی پرانا حساب چکانا ہو۔ صبح کی ہوا میں دھند اس طرح رچی ہوئی تھی کہ سامنے کھڑا آدمی بھی ادھورا دکھائی دیتا۔ اسی ادھورے پن میں سلیم دفتر پہنچا اور دروازے کے شیشے پر جمی نمی میں اپنی صورت کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ اس کی شکل مکمل نہیں، جیسے کسی نے مٹی سے انسان بناتے ہوئے اچانک ہاتھ روک لیا ہو۔

وہ محکمۂ اراضی کے نچلے درجے کا کلرک تھا۔ نہ اتنا اہم کہ اس کے بغیر کام رک جائے، نہ اتنا غیر اہم کہ فہرستوں سے اس کا نام مٹایا جا سکے۔ اس کی میز کمرے کے آخری کونے میں تھی جہاں روشنی پوری نہیں پہنچتی تھی۔ اوپر لٹکا بلب اکثر جھپکتا رہتا، جیسے اسے بھی یقین نہ ہو کہ جلنا چاہیے یا نہیں۔

سلیم کا کام زمینوں کے انتقال کی فائلیں دیکھنا تھا۔ کاغذوں پر کھنچی لکیروں سے وہ اندازہ لگاتا کہ کس کا کتنا حق ہے۔ اسے ہمیشہ حیرت ہوتی کہ زمین، جو صدیوں سے وہیں پڑی ہے، انسان اس کے ٹکڑے کر کے کیسے مالک بن جاتا ہے۔ مگر وہ سوال نہیں کرتا تھا۔ سوال اس کے منصب میں شامل نہیں تھے۔

ایک دن اس کی میز پر ایک موٹی سی فائل آئی۔ سرخ فیتے میں بند، کاغذ نئے اور مہنگے۔ اوپر لکھا تھا: فوری کارروائی ضروری ہے۔" اس نے فائل کھولی تو معلوم ہوا کہ شہر کے کنارے آباد ایک پرانی بستی کو "توسیعی منصوبے" کے لیے خالی کرانا ہے۔ کاغذوں میں لکھا تھا کہ زمین سرکاری

نعمان منظور

ہے اور مکین ناجائز قابض۔ سلیم نے نقشہ دیکھا۔ وہ بستی اس کے بچپن کی گزرگاہ تھی۔ وہیں اس کی ماں کسی زمانے میں لوگوں کے گھروں میں سلائی کیا کرتی تھی۔ وہیں ایک کچی گلی میں اس کو پہلا زخم لگا تھا اور وہیں اس نے پہلی بار پتنگ اڑائی تھی۔

اس نے کاغذات دوبارہ دیکھے۔ تاریخیں بدلی ہوئی تھیں۔ پرانے ریکارڈ غائب تھے۔ سب کچھ اس قدر صفائی سے کیا گیا تھا کہ اعتراض کی گنجائش کم رہ جائے۔ مگر سلیم کی آنکھ کاغذوں کی زبان سمجھتی تھی۔ اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ بستی کو مٹانے کا فیصلہ بہت پہلے ہو چکا تھا، یہ فائل محض رسم تھی۔

اس نے فائل بند کی اور کرسی سے ٹیک لگا لی۔ کمرے میں دوسرے کلرک ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ کسی کو اس فائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ کام اس کے حصے میں آیا تھا کیونکہ وہ ’’سنجیدہ‘‘ سمجھا جاتا تھا۔ سنجیدہ لوگ ہمیشہ مشکل فیصلوں کے لیے چنے جاتے ہیں۔

شام تک وہ فائل کو دیکھتا رہا۔ اس نے سوچا، اگر وہ دستخط نہ کرے تو کیا ہوگا؟ فائل رُک گی، شاید اوپر سے دباؤ آئے گا، شاید اس کا تبادلہ ہو جائے، شاید نوکری خطرے میں پڑ جائے۔ اس نے اپنے گھر کا تصور کیا۔ ایک کرائے کا کمرہ، جس کی دیواروں پر نمی کے داغ تھے۔ ماں کی پرانی تصویر جو اب زرد ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی جو حساب لگاتے لگاتے تھک جاتی تھی کہ مہینے کا خرچ کیسے پورا ہوگا۔ اس کے دو بچے جو ابھی زمین اور ملکیت کے فرق سے بے خبر تھے۔

اگلی صبح اس نے افسر کے کمرے میں جا کر آہستہ سے کہا کہ فائل میں کچھ تضاد ہے۔ افسر نے عینک اتار کر اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔ وہ مسکراہٹ نرم تھی، مگر اس میں سردی تھی۔ اس نے کہا، سلیم صاحب، ہم سب کو نظام کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ آپ صرف کاغذ مکمل کریں۔ باقی معاملات اوپر دیکھ لیے گئے ہیں۔ ’’سلیم نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ حلق میں اٹک گئے۔ وہ واپس اپنی میز پر آ بیٹھا۔

اس دن کے بعد دفتر کا ماحول بدل گیا۔ کوئی اس سے براہِ راست کچھ نہ کہتا، مگر نگاہوں میں ایک خاموش تنبیہ تھی۔ چائے والا بھی اس کی میز پر کپ رکھتے ہوئے ہلکا سا توقف کرتا، جیسے وہ کسی متعدی بیماری کا شکار ہو۔ سلیم نے پہلی بار محسوس کیا کہ اختلاف ایک آواز نہیں، ایک تنہائی ہے۔ دو دن بعد بستی میں نوٹس چسپاں ہو گئے۔ لوگوں کو ایک

ماہ میں گھر خالی کرنے کا حکم تھا۔ سلیم شام کو وہاں سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ بچے اُسی گلی میں کھیل رہے ہیں، عورتیں چولہے جلا رہی ہیں، مرد دن بھر کی مزدوری کے بعد بیٹھے ہیں۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ختم ہو سکتا ہے۔ ایک بوڑھا اُسے پہچان گیا۔ اس نے کہا، ''بیٹا تم تو یہیں کے ہو نا؟ سنا ہے دفتر میں ہو۔ یہ کاغذ غلطی سے لگ گئے ہیں نا؟''

سلیم نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اسے لگا وہ اپنی ماں کی آنکھیں دیکھ رہا ہے۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف اتنا بولا، ''میں دیکھتا ہوں چچا۔'' مگر وہ جانتا تھا کہ وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ کاغذ دیکھنے والا آدمی فیصلے نہیں بدلتا۔

گھر آ کر وہ دیر تک جاگتا رہا۔ اسے لگتا تھا کہ دیواروں کے داغ بڑھ رہے ہیں، جیسے نمی اندر سے رس رہی ہو۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ دستخط نہ کرے۔ شاید وہ بیمار پڑ جائے۔ شاید چھٹی لے لے، مگر اگلے دن وہ پھر دفتر پہنچ گیا۔ انسان اکثر وہی کرتا ہے، جس سے وہ نفرت کرتا ہے، کیونکہ اسے زندہ رہنا ہوتا ہے۔

فائل اس کی میز پر رکھی تھی۔ سرخ فیتہ کھلا ہوا تھا۔ آخری صفحے پر دستخط کی جگہ خالی تھی۔ اس نے قلم اٹھایا تو ہاتھ کانپ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی زمین پر نہیں، اپنے بچپن پر دستخط کر رہا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور نام لکھ دیا۔

اسی لمحے اسے ایک عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ جیسے فیصلہ اس کے ہاتھ سے نکل کر کسی اور کے سپرد ہو گیا ہو۔ وہ شام کو گھر آیا تو غیر معمولی خاموش تھا۔ بیوی نے پوچھا، ''طبیعت ٹھیک ہے؟'' اس نے سر ہلا دیا، مگر اس کی آنکھوں میں کوئی روشنی نہ تھی۔

ایک ماہ بعد بستی پر بلڈوزر چلے۔ خبریں آئیں، چند تصاویر سوشل میڈیا پر گھومیں، پھر سب کچھ معمول پر آ گیا۔ وہاں اب ایک بڑا سا بورڈ لگا تھا: ''نیا رہائشی منصوبہ — جدید زندگی کی علامت۔''

سلیم کبھی کبھی اس راستے سے گزرتا۔ اسے لگتا زمین کے نیچے سے کوئی سانس لے رہا ہے۔ جیسے راکھ کے نیچے آگ پوری طرح بجھی نہ ہو۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ ملبے کے پاس ایک بچہ اینٹوں سے گھر بنا رہا ہے۔ وہ چند لمحے رُکا رہا، پھر آگے بڑھ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ زیادہ دیر ٹھہرا رہا تو زمین اس کا نام پکار لے گی۔

دفتر میں اس کی کارکردگی بہتر سمجھی جانے لگی۔

افسر اس سے خوش تھا۔ ایک دن اسے ترقی کی اطلاع ملی۔ نئی میز، روشن کمرہ، بڑا بلب، سب نے مبارک دی۔ اس نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔ مگر اسے یوں لگا جیسے روشنی اس کی آنکھوں میں چبھ رہی ہو۔

وقت گزرتا گیا۔ شہر پھیلتا گیا۔ نئی عمارتیں، نئے منصوبے، نئی فائلیں۔ سلیم کے دستخط بڑھتے گئے۔ ہر دستخط کے ساتھ اس کے اندر کچھ کم ہوتا گیا۔ اسے کبھی کبھی اپنا نام یاد کرنے میں لمحہ بھر لگتا۔ جیسے وہ خود بھی کسی فائل کا حصہ ہو۔

ایک رات اسے خواب آیا کہ وہ اسی پرانی بستی کی گلی میں کھڑا ہے۔ گرد و غبار اڑ رہا ہے۔ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں مگر پہچان نہیں رہے۔ وہ بولنا چاہتا ہے کہ میں تم میں سے ہوں، مگر آواز نہیں نکلتی۔ اچانک زمین پھٹتی ہے اور اس کے نیچے سے کاغذوں کا ڈھیر نکلتا ہے۔ ہر کاغذ پر اس کے دستخط ہیں۔ وہ ڈھیر آہستہ آہستہ اسے ڈھانپ لیتا ہے۔

وہ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے پانی پیا اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دور کہیں تعمیراتی مشینوں کی آواز آ رہی تھی۔ شہر اب بھی جاگ رہا تھا۔

کچھ دن بعد دفتر میں ایک نئی فائل آئی۔ ایک اور بستی، ایک اور منصوبہ۔ اس نے فائل کھولی، پھر بند کر دی۔ کافی دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دراز سے ایک خالی کاغذ نکالا اور اس پر لکھا: ’’ریکارڈ نامکمل ہے۔ مزید جانچ ضروری ہے۔‘‘ اس نے وہ کاغذ فائل میں لگا دیا۔

اسے معلوم تھا کہ اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ تبادلہ، تنزلی، یا خاموش سزا۔ مگر اس لمحے اسے پہلی بار لگا کہ راکھ کے نیچے واقعی سانس موجود ہے۔ کمزور سہی، مگر زندہ۔

شاید شہر اسے مٹا دے گا۔ شاید اس کا نام بھی کسی دن فہرستوں سے غائب ہو جائے۔ مگر اگر زمین کبھی گواہی دے تو وہ کہہ سکے گا کہ ہر بار اس نے دستخط نہیں کیے تھے۔

سردی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ دھند چھٹ رہی تھی۔ صبح کی روشنی میں شہر تھوڑا واضح دکھائی دینے لگا تھا۔ سلیم نے کھڑکی کھولی۔ ہوا ٹھنڈی تھی مگر کاٹتی ہوئی نہیں۔ اسے لگا کہ شاید انسان مکمل نہیں ہوتا، مگر ادھورا رہ کر بھی ایک لمحہ ایسا آتا ہے جس کا وہ فیصلہ خود کرتا ہے۔

اور کبھی کبھی بس اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ راکھ کے نیچے سانس باقی رہے۔

☆☆☆☆☆

غزل

ذہن میں یاد یار سا ، کچھ ہے
ایک جھلمل غبار سا ، کچھ ہے

آج دل کی وہ چھب ، وہ دھج نہ سہی
ہجر میں داغ دار سا ، کچھ ہے

موت کی چمپئی ہتھیلی پر
اک گل نو بہار سا ، کچھ ہے

تن شکن ، جاں شکن ، حیات شکن
دل میں خنجر کی دھار سا ، کچھ ہے

ایک ضرب اور اے حواس شکن
آج رگ رگ خمار سا ، کچھ ہے

پھول ہیں ، تتلیاں ہیں ، آنچل ہیں
چار سو ، انتشار سا ، کچھ ہے

طبع آزاد پر گراں شاید
بام و در کے حصار سا کچھ ہے

شہر گل بھی سیاہ پوش لگا
آج دل سوگوار سا کچھ ہے

پھر شراب و شعور یک جاں ہیں
گرم پھر کارزار سا کچھ ہے

آہٹوں کے چراغ جلنے لگے
شام سے انتظار سا کچھ ہے

پس بند نقاب ، نور نما
پھلجھڑی یا انار سا کچھ ہے

بار ور شاخ شاخ ہے ، لیکن
خم بہ خم انکسار سا کچھ ہے

ظلم حد سے گزر نہ جائے کہیں
کج ادا ، شرمسار سا کچھ ہے

پگڑیوں کے حصار سے آگے
تخت پر تاجدار سا کچھ ہے

زیب پا ، بیڑیاں نہیں خالد
حلقۂ اختیار سا کچھ ہے

خالد احمد

غزل

ہماری سوچ دھندلانے کے سپنے دیکھتے ہو
نہ ہوں پورے تو کس زہری نظر سے دیکھتے ہو

شبوں کی تیرگی ہم پر مسلط کرنے والو
ہماری صبح کے تارے ابھرتے دیکھتے ہو!

کوئی تصویر ہو پائے بھلا کیسے مکمل
کہ سارے عکس تم آدھے ادھورے دیکھتے ہو

دِکھے کیا، آپ ہو جاتے ہو تم منظر کا حصہ
کچھ اتنے جوش میں آگے نکل کے دیکھتے ہو

بدل کر اپنا اندازِ نظر اک بار دیکھو
کُھلے، ویسا ہی سب دکھتا ہے جیسے دیکھتے ہو

نظر آتے ہیں تم کو صرف تصویریں سب انساں
بیاضِ دل کہاں پڑھتے ہو چہرے دیکھتے ہو

کرو گے اور کتنی ست رفتارِ مسافت
کہ تم اک اک قدم پر مڑ کے پیچھے دیکھتے ہو

کبھی سوچا ہے تم نے، ایک ہی چہرے کو عالی
رتوں کے آئنوں میں کیسے کیسے دیکھتے ہو

جلیل عالی

غزل

دل میں جل اٹھا چراغ آرزو
آنسوؤں سے ہو رہی ہے گفتگو

خواب میں دیکھی تھی اک تصویر سی
آج بھی ہے نقش دل پر ہو بہو

ظلمتیں حد نظر سے ماورا
وحشتیں بھی خیمہ زن ہیں کو بہ کو

رونقیں دل کی تماشا بن گئیں
اب کہاں سے لائیں پہلی سی نمو

منزل مقصود غائب ہو گئی
کار مشکل ہو گئی ہر جستجو

ساحلوں سے دوستی مہنگی پڑی
ہم کہ دریا سے ہوئے ہیں آب جو

حرمت لفظ و معانی گرد ہے
ہے کتاب زندگی بے آبرو

پیش رفت دم بہ دم بے آس ہے
بے حقیقت ہو گیا عزم نمو

زور و زر کے ہیں کرشمے زور پر
گونجتے ہیں آج جس سے کاخ و کو

چپکے چپکے آنکھ نے سب کچھ کہا
اتفاقاً جب ہوئے وہ روبرو

تنگ گلیوں میں ہے پھر بھی روشنی
شاہراہوں پر اندھیرے چار سو

ہے ریاض دل کی خوشبو دائمی
ہیں یہاں کے پھول محو ذکر ہو

سید ریاض حسین زیدی

غزل

بلا کی حبس میں جھونکے ہوا کے چھوڑوں گا
جمال حرف تجھے گنگنا کے چھوڑوں گا

نفس نفس میں اتاروں گا ذوق و شوق نمو
حیات بار گراں ہے اٹھا کے چھوڑوں گا

میں دیکھتا ہوں کہاں تک طویل ہوتی ہے
سیاہ رات کو سورج دکھا، کے چھوڑوں گا

اسے بھی لاؤں گا تعبیر کے تعاقب میں
میں اپنا خواب اسے بھی دکھا کے چھوڑوں گا

بتا رہا ہے یہ منزل گریز شوق سفر
یہ راستہ بھی کہیں دور جا کے چھوڑوں گا

رگوں سے کھینچ کے لاتا ہوں اس لیے آنسو
وہ روئے گا میں اگر مسکرا کے چھوڑوں گا

جسے بھی غم کے معانی سمجھ نہیں آتے
قریب جا کے اسے کربلا کے چھوڑوں گا

میں خود سے جنگ میں ہاروں مجھے قبول نہیں
شکست حرف غلط ہے مٹا کے چھوڑوں گا

گریز چاہیے بے کار وسوسوں سے کنور
بنے نہ بات جہاں پر بنا کے چھوڑوں گا

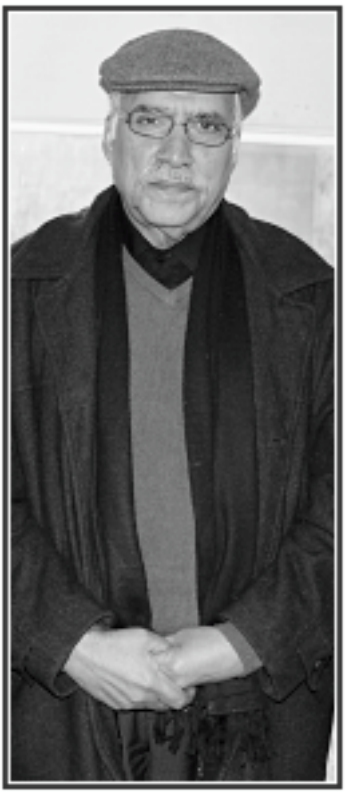

اعجاز کنور راجہ

غزل

آ رہے ہیں نہ جا رہے ہیں ہم
گھر کی رونق بڑھا رہے ہیں ہم

آجکل کچھ نہ کر کے صبح و شام
وقت اپنا بچا رہے ہیں ہم

پھر کبھی اے غمِ جہاں! اِس وقت
پی رہے ہیں پلا رہے ہیں ہم

عشق کا راستہ نہیں ہموار
ڈگمگا ڈگمگا رہے ہیں ہم

کون ہوتا ہے فطرۃً ایسا
عادۃً پارسا رہے ہیں ہم

ہم سے پُوچھو خدا کا دردِ سر
کچھ دنوں ناخدا رہے ہیں ہم

رابطے کی کوئی سبیل کہاں
چاہ بے انتہا رہے ہیں ہم

کیا دُکھ اُس کی بے وفائی کا
خود کہاں باوفا رہے ہیں ہم

سستے وقتوں میں طے ہوئی تھی جو
وہی تنخواہ پا رہے ہیں ہم

ایک جنجال میں رہے ہیں شعور
آپ کے ساتھ کیا رہے ہیں ہم

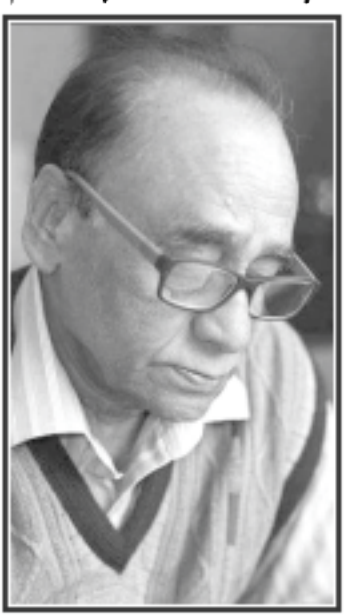

انور شعور

غزلیں

کیا کیجیے اظہار یہاں دیدہ وری کا
اِس شہر میں موسم ہے ابھی کم نظری کا

آنکھوں میں نمی، سوکھ گیا ہے مرا سینہ
یعنی کہ میں سلطان ہُوا خشک وتری کا

بے صبر تھے جو شاخ سے پھل توڑنے والے
اَب اُن کو سدا سامنا ہے بے ثمری کا

وہ طرزِ سخن میر و اسد کا کبھی دیکھیں
اِس شعبے میں دعویٰ ہے جنھیں ناموری کا

معلوم ہے سب کو مری معدوم خیالی
خبروں میں بھی چرچا ہے مری بے خبری کا

خاور اعجاز

وہ عرش نشیں جب دلِ مشتاق میں آیا
اِک حوصلہ مجھ کشتۂ آفاق میں آیا

کردیں گے بھسم بادِ مخالف کو مرے دیپ
اِک جھونکا بھی اُس کا جو مرے طاق میں آیا

مانگا تھا مسیحا سے علاجِ غمِ دوراں
اِک زہر پیالہ ہمیں تریاق میں آیا

تصویرِ خزاں، دفترِ گُل، حرفِ ندامت
کیا کچھ نہیں تاریخ کے اوراق میں آیا

غزل

نہیں ایسا کہ آندھی میں شجر باقی نہیں رہتا
بس اتنا ہے کہ شاخوں پر ثمر باقی نہیں رہتا

در و دیوار گرنے پر اٹھائے جا بھی سکتے ہیں
مکیں جب ٹوٹنے لگتے ہیں گھر باقی نہیں رہتا

ہوا کے زور پر اڑنا بہت آسان ہوتا ہے
مگر اس میں وقارِ بال و پر باقی نہیں رہتا

کیے رکھتی ہے پاگل سب کو خواہش تاجپوشی کی
نہیں معلوم رہتا ہے کہ سر باقی نہیں رہتا

حقیقت سامری کے شعبدوں کی کھل ہی جاتی ہے
زیادہ دیر جادو کا اثر باقی نہیں رہتا

خبر شاید نہیں انعام کے تقسیم کاروں کو
غلط بخشی کی صورت میں ہنر باقی نہیں رہتا

غنیمت ہے اگر گلزار ننگ و نام رہ جائے
ہمیشہ کے لیے کوئی بشر باقی نہیں رہتا

گلزار بخاری

غزل

ہے ایک بوجھ جو زادِ سفر ضروری نہیں
نکال پھینک مجھے بھی اگر ضروری نہیں

خیال بھی تو کراتا ہے کائنات کی سیر
اڑان کا ہو ارادہ تو پر ضروری نہیں

سمجھ میں آتی نہیں اُس کی مصلحت اس میں
اُدھر برستے ہیں بادل جدھر ضروری نہیں

شبِ وصال میں بوس و کنار پر مت ٹال
ہو اتفاق یہ بارِ دگر ضروری نہیں

رکیں گے ہم نہ مگر مشعلیں جلانے سے
نصیب ہو ہمیں دیدِ سحر ضروری نہیں

زمانہ جلد بھلا دے گا دیکھنا راحت
کہ یوں تو خاص ہے تو بھی مگر ضروری نہیں

راحت سرحدی

غزلیں

اک پَل کو دھوپ جیسا وہ آیا تھا، اور کیا
پھر اُس کے بعد شام کا سایہ تھا، اور کیا

یہ قوس اور زاویے ویسے نہیں رہے
پرکار کو ذرا سا گھمایا تھا، اور کیا

کرنوں نے میرے جسم میں پھر چھید کر دیئے
آنگن کا ایک پیڑ گرایا تھا، اور کیا

سانسیں اُلجھ اُلجھ گئیں اس اڑتی راکھ میں
ایندھن بنا کے جسم جلایا تھا، اور کیا

چھوٹی سی اک اڑان میں پَر اُس کے جھڑ گئے
اک ریت کا پرندہ بنایا تھا، اور کیا

کچھ آتی جاتی رُت کی خبر ہی نہ ہو سکی
اک ہجرِ زرد، تن پہ سجایا تھا اور کیا

پھر قحط میرے کھیت سے نکلا نہ ایک عمر
بادل سے میں نے ہاتھ ملایا تھا، اور کیا

قیوم طاہر

اس بقا میں، بجز فضا کیا ہے
کوئی منزل بھی، راستہ کیا ہے

کوئی آواز کی گرہ کھولے
پردۂ ساز میں چھپا کیا ہے

نام لکھا ہوا ہے ہر شے پر
میرے گھر میں مگر مرا کیا ہے

ایک یہ میں ہوں دوسرا بھی میں
اور اس شہر میں رکھا کیا ہے

یہ ستارہ ہے یا کوئی پتھر
پاؤں میں یہ گرا ہوا کیا ہے

اُلجھی سانسوں سے لفظ ہیں طاہر
کیا مٹایا گیا، لکھا کیا ہے

غزل

صبر کر جائیں گے نالش نہیں کرنے والے
ہم ترے غم کی نمائش نہیں کرنے والے

ہم کو زیبا ہی نہیں خلعت و انعام کا بوجھ
عشق بردار یہ خواہش نہیں کرنے والے

بیٹھ جاتے ہیں تری بزم کے کونے میں کہ ہم
اپنے ہونے کی نمائش نہیں کرنے والے

تم فقط بابِ سماعت کو کشادہ کر لو
بعد ازاں کوئی گذارش نہیں کرنے والے

ہم تہی دست سہی مصلحت اندیش نہیں
دل نہ مانے تو ستائش نہیں کرنے والے

یہی کافی ہے زمانہ ہمیں تسلیم کرے
ہم کسی اجر کی خواہش نہیں کرنے والے

پیش کر دیں گے مقابل میں خد و خال ترے
ہم گلابوں کی سفارش نہیں کرنے والے

دل سے چپ چاپ گزر جاتے ہیں صدے طالب
یہ وہ بادل ہیں جو بارش نہیں کرنے والے

طالب انصاری

غزل

خرد آزادیِ افکار روکے
طریقِ برہمی سردار روکے

کوئی تسکین کی خاطر بھی سوچے
جنونِ خواہشِ آزار روکے

وہ خود بے تاب ہیں ملنے کو مجھ سے
حیا ہی شوخیِ اظہار روکے

سبھی پیارے بچھڑتے جا رہے ہیں
کوئی تو وقت کی رفتار روکے

دلوں میں اور فضا میں حبس طاری
ہوا ، طوفان کے آثار روکے

کبھی ہنس ہنس کے وہ انکار کرنا
کبھی کرتے ہیں وہ اقرار روکے

کبھی مائل کرے جدت طرازی
مگر پامالیِ اقدار روکے

مسیحائی فقط سودا گری ہے
یہ کاروبار کیا بیمار روکے

در گنج شکر ساجد نہ چھوڑوں
زمانہ گر مجھے سو بار روکے

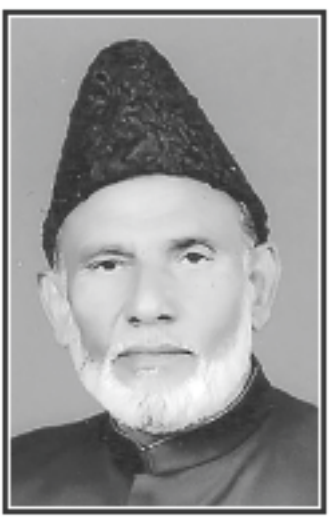

شریف ساجد

غزل

کبھی کبھی اُس کی مِس کال بھی آتی رہتی ہے
تنہائی میں اپنی یاد دلاتی رہتی ہے

بولتی ہے تو رنگ ہی رنگ بکھرتے جاتے ہیں
ہنستی ہے تو پھولوں کو مہکاتی رہتی ہے

میں بھی اُس کی گنّی کھا کر، ڈولنے لگتا ہوں
وہ بھی ہولے ہولے ڈور ہِلاتی رہتی ہے

جیسے کوئی دُور کنارے چُنتا رہتا ہو
شام ڈھلے، دریا میں پھول بہاتی رہتی ہے

ترکِ تعلّق کر لینا بھی اُس کا فیصلہ تھا
ترکِ تعلّق کر کے اب پچھتاتی رہتی ہے

ایک بھی لفظ نہیں ہے اُس کے سُوکھے ہونٹوں پر
اُس کی خاموشی ہی شور مچاتی رہتی ہے

باتیں کرتے کرتے ہی رونے لگ جاتی ہے
اور مجھے بھی اپنے ساتھ رُلاتی رہتی ہے

میں اپنے کمرے میں بیٹھا دیکھتا رہتا ہوں
وہ اپنے رُوٹھے لمحات مناتی رہتی ہے

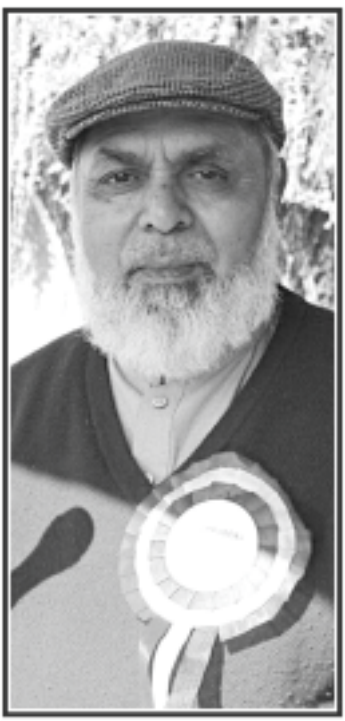

محمد انیس انصاری

غزل

میری خوش بختیوں کا یہ ثمر ہے
اُسی کے شہر میں میرا بھی گھر ہے

اچانک اک نظر دیکھا تھا اُس نے
نگاہوں میں وہ اب بھی جلوہ گر ہے

رگ و پے میں سمایا مثلِ خوشبو
یہ اُس کی رُبائی کا اثر ہے

اندھیری شب میں بھی رستہ دکھائے
وہ جگنو ہے کہ یا کوئی شرر ہے

سکونِ قلب ہے ہونٹوں پہ مرے
اُسی کا نام جو شام و سحر ہے

اسے کرنا ہے حاصل ٹھان لی ہے
یہ مانا راستہ بھی پُرخطر ہے

ہوں یوسفؑ کے خریداروں میں شامل
نہیں گو پاس میرے سیم و زر ہے

بنامِ مصلحت خاموش ہوں میں
وگرنہ مجھ کو ہر پل کی خبر ہے

ذرا اقبال کو پہچان اپنے
کہ وہ اہلِ ہنر اہلِ نظر ہے

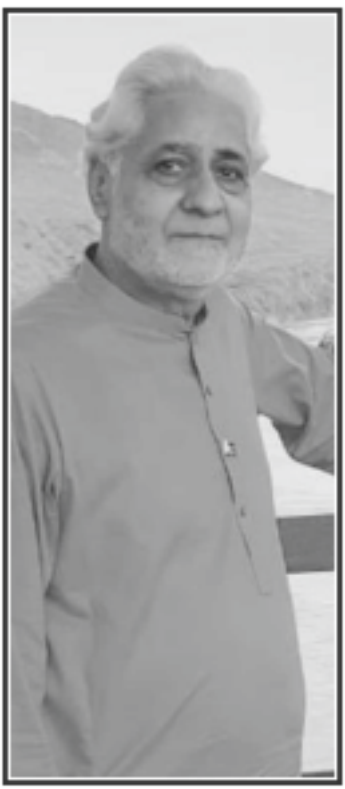

اقبال سروبہ

غزل

دیپ سے دیپ جلاؤ کہ محبت پھیلے
فاصلے دل کے مٹاؤ کہ محبت پھیلے

ملنے والوں کو نہیں بھاتی کدورت کوئی
تم بھی دیوار گراؤ کہ محبت پھیلے

اپنے دامن میں بھرو درد شکیبائی کے
زخم کوئی نہ لگاؤ کہ محبت پھیلے

بات کرنی ہے تو پھر پھول سے لہجے میں کرو
زہر ہونٹوں سے ہٹاؤ کہ محبت پھیلے

ہجر کی آگ میں برسات بھلی لگتی ہے
گیت رم جھم کے سناؤ کہ محبت پھیلے

نفرتیں جنگ کے شعلوں کو ہوا دیتی ہیں
امن کے پھول کھلاؤ کہ محبت پھیلے

ناامیدی سے کہاں دل کے کنول کھلتے ہیں
آس کو دل میں جگاؤ کہ محبت پھیلے

نثار ترابی

غزل

دامانِ اعتبار سے، جھٹکا ہوا کوئی
بکھرے ہوئے وجود میں، سمٹا ہوا کوئی

خُم خانۂ حیات کے در پر ٹھٹھک گیا
باطن کے اضطراب سے، چھلکا ہوا کوئی

کیا، اپنے آپ تک بھی پہنچ پایا ہے کبھی
دنیا، ترے غبار میں بھٹکا ہوا کوئی

زنجیر ہو گیا مگر، آزاد ایک شخص
بے نام رابطوں میں تھا، الجھا ہوا کوئی

ہے مٹھی بھر دھڑکتی ہوئی خاک میں نہاں
زود آشنائی درد سے ، لیتا ہوا کوئی

پڑھ پائے گا تو کیا اُسے، خود پر نہ کھل سکا
یک ورقہ داستان میں، لپٹا ہوا کوئی

دھرتا نہیں ہے کان، مگر رندِ لم یزل
یہ کس انا کی ڈال ہے، اٹکا ہوا کوئی

خلقت تمام اُس کی غلامی سے سرفراز
دیکھو گے ہر مقام ہی، داغا ہوا کوئی

''کیا میں تمھارا رب نہیں'' کی بازگشت سے
ایسا بھی تم نہ دیکھو گے، رسوا ہوا کوئی

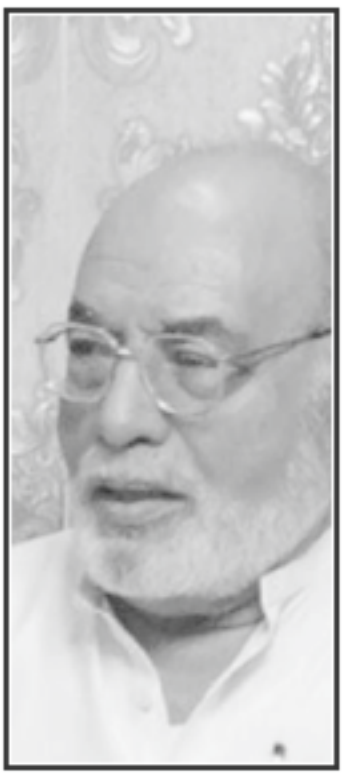

طارق بٹ

غزل

دیکھیے تو کس قدر چھوٹا جہاں چڑیا کا ہے
سوچیے تو یہ زمین و آسماں چڑیا کا ہے

چونچ سے پانی کے قطرے ڈالتی ہے آگ پر
لگتا ہے جلتے مکاں میں آشیاں چڑیا کا ہے

شاخِ دل پر مسکراتی پینگ اک چڑیا کی ہے
اس کی خوشبو سے مہکتا یہ مکاں چڑیا کا ہے

اپنے بچے خُود اُڑا کر آنکھ نم کرتی نہیں
دیکھو کتنا حوصلہ اس ناتواں چڑیا کا ہے

سوچتا ہوں ایک دن اُڑ جائے گی پردیس میں
اپنی بیٹی پر مجھے ہوتا گماں چڑیا کا ہے

لمحہ لمحہ ہوتے ہیں صدمات ننھی جان پر
اس جہاں میں اک نرالا امتحاں چڑیا کا ہے

اس سے بنتے ہیں میرے شعروں کے سارے زاویے
میری غزلوں میں ترنم بے زباں چڑیا کا ہے

بادلوں کو دیکھ کر رقصاں ہوئی ہے شوق سے
کھٹی میٹھی دھوپ کا یہ سائباں چڑیا کا ہے

میرے کمرے میں کرے ذکرِ الٰہی صبح و شام
برکتوں کا سلسلہ اِک مہرباں چڑیا کا ہے

عقیل رحمانی

غزل

نہیں آج کل یہ مجھے خبر کہ مَیں ایک ہوں کہ ہزار ہوں
کبھی چل رہی ہوں زمین پر، کبھی آسماں پہ سوار ہوں

جو خزاں سے بڑھ کے خزاں لگے، میں یہ کیسی فصلِ بہار ہوں
جو تری ہوا میں بکھر گیا، میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

میں اگرچہ تیری امان ہوں، میں اگرچہ تیرا حصار ہوں
ترے دشمنوں میں شمار تھی، ترے دشمنوں میں شمار ہوں

وہی خواہشیں ہیں نصیب ور ترے آستاں پہ جو مر گئیں
جو پہنچ کے در سے پلٹ گئی، وہی چیخ ہوں، وہ پکار ہوں

مجھے ورثے میں جو ملا تھا غم، وہ تو کچھ نہیں ہے تری قسم
ترے ہجر نے جو عطا کیے اُنھی آنسوؤں کی قطار ہوں

مِٹی روشنی کہاں زندگی، ابھی دل میں اِن کی جگہ نہیں
مرے دل میں دفن ہیں حسرتیں، میں تو آپ اپنا مزار ہوں

اے خدا جو بخشی ہیں نعمتیں، یہ جو رحمتیں، یہ جو برکتیں
میں ہمیشہ شُکر گزار تھی، میں ہمیشہ سجدہ گزار ہوں

خالدہ انور

غزل

سب گلے، سارے شکوے بھلا دیجئے
عید ہے جانِ من! مسکرا دیجئے

سال بھر ہم جفائیں ہی سہتے رہے
آج تو کچھ وفا کا صلہ دیجئے

سال بھر ہم ترستے رہے دید کو
آج تو رُخ سے پردہ ہٹا دیجئے

سال بھر ہم کرم کے رہے ملتجی
آج تو بات بگڑی بنا دیجئے

سال بھر حسن پردوں میں پنہاں رہا
آج تو رُوئے زیبا دکھا دیجئے

سال بھر وصل کا جام چھلکا نہیں
آج تو پیاس دل کی بجھا دیجئے

سال بھر قرب کی آگ بھڑکی نہیں
آج تو فاصلے سب مٹا دیجئے

آج تو لذتِ آگہی بخشیے
آج تو مجھ کو میرا پتا دیجئے

آج تو بے نوا سے دُعا لیجئے
آج تو سوئی قسمت جگا دیجئے

آج تو اپنے فیضان کو دیکھئے
آج تو رُوح کو جگمگا دیجئے

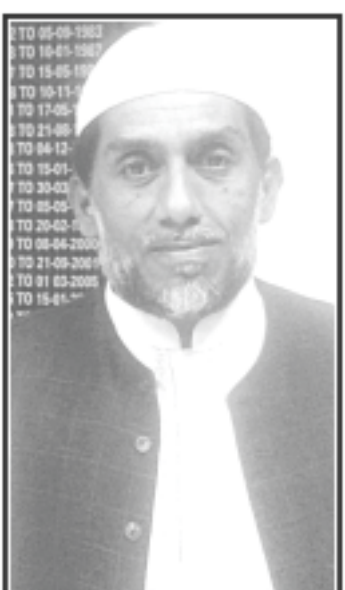

فیض رسول فیضان

غزل

بدلی بدلی سی نظر دیکھ کے رونا آیا
کیا وہی ہے یہ نگر دیکھ کے رونا آیا

جس کو اصرار تھا دستار ہو میرے سر پر
اس کے کاندھوں پہ نہ سر دیکھ کے رونا آیا

کل بٹھاتا تھا زمانہ جسے سر آنکھوں پر
آج اسے خاک بہ سر دیکھ کے رونا آیا

میں نے کل جس پہ ترے نقش قدم دیکھتے تھے
سونی وہ راہ گزر دیکھ کے رونا آیا

جس کو اوجھل ہوئے آنکھوں سے زمانہ بیتا
آج اسے بار دگر دیکھ کے رونا آیا

یہ نہ معلوم تھا کہتے ہیں محبت اس کو
اپنی آہوں میں اثر دیکھ کے رونا آیا

جن کے دیکھے سے پگھل جاتے تھے لوہے کے وجود
آج ان آنکھوں میں ڈر دیکھ کے رونا آیا

وہ جو کافی تھی بہت رو کے بڑی مشکل سے
یہ ہے اس شب کی سحر دیکھ کے رونا آیا

محمد افضال انجم

غزل

بحث بنتی تھی زمانے سے، زمانے سے ہوئی
تیرے آنے کی خبر تھی، ترے جانے سے ہوئی

دوسری تھی وہ ملاقات تمھاری میری
جب مری پہلی ملاقات زمانے سے ہوئی

یہ جو ترتیب اُلٹ ہے، فقط اُلٹی نہ سمجھ
یہ اُلٹ وہ ہے جو ترتیب میں آنے سے ہوئی

اِس غزل سے ترا آنا نہیں ثابت پھر بھی
یہ غزل وہ ہے جو تیرے چلے جانے سے ہوئی

ہاتھ بھی ہوتے ہیں میرے، مجھے حیرانی ہے
اور یہ حیرانی تجھے ہاتھ لگانے سے ہوئی

مجھے تشویش رہی کار گہ دُنیا میں
میری پہچان غلط تیر چلانے سے ہوئی

ایک ہی بات جو لوگوں میں ہوئی دو، دو بار
کبھی تیرے، کبھی میرے نظر آنے سے ہوئی

قید بڑھتی ہوئی پہنچی سرِ عالم، سرِ عام
وہ جو آغاز ترے آئنہ خانے سے ہوئی

ہو گئی، ہو ہی گئی بیچ کی دیوار تمام
میرے ڈھانے سے ہوئی، تیرے بنانے سے ہوئی

شاہین عباس

غزل

ہر لمحہ خوشگوار مرے ساتھ ساتھ تھا
جب موسم بہار مرے ساتھ ساتھ تھا

اس شب تو میں چراغ کی صورت جلی رہی
جس شب خیال یار مرے ساتھ ساتھ تھا

تیری تلاش میں ، میں جہاں اور جدھر گئی
اڑتا ہوا غبار مرے ساتھ ساتھ تھا

تو ساتھ تھا تو دور تلک راہگزار میں
گنجینۂ بہار مرے ساتھ ساتھ تھا

اپنی نگاہ میں بھی بڑی معتبر رہی
جب تیرا اعتبار مرے ساتھ ساتھ تھا

افروز اس کی یاد کی دہلیز پر سدا
اک خوابِ انتظار مرے ساتھ ساتھ تھا

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کل حقیقت ہے فسانوں کی طرح بھول نہ جائے
گم فسانوں میں اگر آج کا فنکار ہوا

غزل

شہر دیکھا نہ کبھی گاؤں دوبارہ دیکھا
میرے ماں باپ مرے، دیس نہ اپنا دیکھا

ایسی گلیاں کہ جہاں کھیلتے بچپن بیتا
ہاں کبھی خوابوں ہی میں دھندلا سا نقشہ دیکھا

ماں سے جب کہتے تھے دہرایئے، ہجرت بیتی
اشک گرتے تھے بتاتے ہوئے کیا کیا دیکھا

حرف تحسین و تسلی کا لگاتے مرہم
ہوئے خاموش کہ جب زخم ہی گہرا دیکھا

بے سبب لاشے گرے بے بسوں مجبوروں کے
چشم عالم نے عجب ظلم تماشا دیکھا

میں کبھی ،،نیٹ،، میں جو آباء کا وطن دیکھتا ہوں
جانے کیوں لگتا ہے سب کچھ مجھے دیکھا دیکھا

کیسی وہ دکھ بھری ہجرت کی کہانی تھی رضا
جب سنی آہ بھری ، درد کا دریا دیکھا

رضا اللہ حیدر

غزل

جو کل ملا تھا یونہی زندگی کی راہوں میں
وہ آج لگنے لگا ہے مری نگاہوں میں

میں ریزہ ریزہ وہی اعتبار چنتا ہوں
جو کل تلک تھا بہت معتبر نگاہوں میں

ہمارے سوچ اُجالے نہ رک سکے پھر بھی
بہت ہجوم تھے گو ظلمتوں کی راہوں میں

میں کیسے بیچ دوں خودداریوں کے وہ اعزاز
کہ جن کے دم سے میں شامل ہوں کج کلاہوں میں

میں منزلوں کی ہوس سے تہی نہیں ہوں جلیل
الجھ گیا ہوں ذرا راستوں کی بانہوں میں

احمد جلیل

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

انتخاب

– خالد احمد –

نعمان منظور

غزل

متاعِ درد ، فزوں ہو تو بات بن جائے
وفورِ شوق ، جنوں ہو تو بات بن جائے

اُسے بھی میری طرح روز و شب، کہیں پر بھی
نہ دستیاب سکوں ہو تو بات بن جائے

خبر نہیں ہے کسی کو کسی محبت کی
عیاں جو سوزِ دروں ہو تو بات بن جائے

وہ جس جمال کا ہے معترف جہاں سارا
اُسی کا دل پہ فسوں ہو تو بات بن جائے

نصیبِ عشق ، ازل ہی سے عجز رکھتا ہے
غرورِ حسن نگوں ہو تو بات بن جائے

بپا ہو حشر بھی اب ، صورتِ ازل شوکت
صدائے ''کن فیکوں'' ہو تو بات بن جائے

شوکت محمود شوکت

غزل

پہلے یہ گلا تھا کہ بلایا نہیں جاتا
اب یار بلاتے ہیں تو جایا نہیں جاتا

ہم یوں تو بھلانا بھی نہیں چاہتے اس کو
چاہیں بھی تو وہ شخص بھلایا نہیں جاتا

ہاں یار سلگنے کا مزہ اپنا ہی ہے یار
اب سمجھے ہو کیوں اس کو بجھایا نہیں جاتا

میں کاٹ تو دوں روکتی ہیں دھوپ جو مجھ سے
شاخوں سے پرندوں کا اڑایا نہیں جاتا

بچ سکتا تھا میں مجھ پہ جو یہ راز نہ کھلتا
اس آگ سے دامن کو بچایا نہیں جاتا

وعدہ تو میں کر لیتا ہوں وہ کہتا ہے جو بھی
پر مجھ سے کوئی وعدہ نبھایا نہیں جاتا

یا جال ہے ناکارہ صحیح بچھتا نہیں ہے
یا مجھ سے صحیح طور بچھایا نہیں جاتا

محسوس کیا جاتا ہے اس درد کو اکرم
یہ درد کسی کو بھی دکھایا نہیں جاتا

اکرم ناصر

غزل

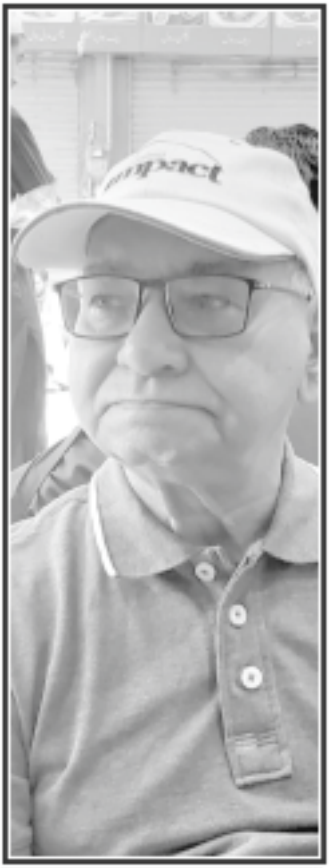

کچھ کرو بات ، اپنے لب کھولو
لب ہیں خاموش ، آنکھ سے بولو

ڈھل گئی رات غم کی ، اُٹھ جاؤ
اے مری جان، آنکھ تو کھولو

جان لے لے گا آہ کا بھرنا
دل دکھا ہے تو پھوٹ کر رو لو

گہرا کاجل ہے پھیلا عارض پر
بہتے اشکوں سے تم اسے دھولو

رات پھر جاگتے ہی گزرے گی
یار اعجاز ، ایک پل سولو

اجمل اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم نے تجھے بے وفا کہا تھا
یہ کرب بھی ہم نے ہی سہا تھا

غزل

فیاض تحسین

سفر کو مختصر کر دیکھ لوں گا
میں تکذیب خضر کر دیکھ لوں گا

وہی بار دگر کر دیکھ لوں گا
ادھر کی شے اُدھر کر دیکھ لوں گا

تری خاطر اگر مرنا ہے لازم
تو تھوڑی دیر مر کر دیکھ لوں گا

تلاش رزق سے فارغ تو ہو لوں
تُجھے بھی آنکھ بھر کر دیکھ لوں گا

فنا گر زندگی کا مسئلہ ہے
تو اس رہ سے گُزر کر دیکھ لوں گا

یہ دنیا اک تماشا ہے تو میں بھی
بس اک لمحہ ٹھہر کر دیکھ لوں گا

زمانے تیرے ہاتھوں سے پھسل کر
کسی کے دل میں گر کر دیکھ لوں گا

غزل

گھری جنگل میں ان شاموں کو دیکھو
درختوں پر لکھے ناموں کو دیکھو

سفر ، مہماں ، بنیرے اور کوے
نکلتے دن سیہ فاموں کو دیکھو

زلیخا ڈھونڈتی پھرتی ہو یوسف
ذرا گندم کے گوداموں کو دیکھو

نظر رکھو جہازوں پر فضا میں
بظاہر لادتے آموں کو دیکھ

بموں کی مشعلیں کب تک جلیں گی
کسی سیڈسٹ کے کاموں کو دیکھو

مرصع کرتی جھپکی ماورائی
صبا کے تخت کے داموں کو دیکھو

لڑھکتے جاتے ہیں اک رنجگے میں
چھلکتے شام کے جاموں کو دیکھو

تنویر قاضی

غزل

آنے لگا ہے وصل کی تاثیر کا مزہ
خوبانیوں کے باغ میں انجیر کا مزہ

جانا کہیں نہیں ہے ترا ساتھ چھوڑ کر
وعدوں میں بھی ہے پاؤں کی زنجیر کا مزہ

لفظوں نے پھر کمال کی تصویر کھینچ دی
کیا کیمرے کی آنکھ سے تصویر کا مزہ

سقراط کا پیالہ کہیں سے تلاش کر
چکھنا اگر ہے عزت و توقیر کا مزہ

دنیا میں بے شمار ہیں قصے کہانیاں
وارث مگر تمہاری کہی ہیر کا مزہ

اچھا لگا ہے جاگتی آنکھوں سے دیکھ کر
لینے لگا ہے خواب بھی تعبیر کا مزہ

انصاف کا ترازو ہمارا نشان ہے
لیتے ہیں روز مفت میں تعزیر کا مزہ

مسعود احمد

غزل

ہر گام ہے غوغائے سگاں ہے، کہ نہیں ہے
رستے میں کسی ڈر کا گماں ہے کہ نہیں ہے

انسان ہی انساں کی پرستش میں جتا ہے
مسجد میں بسا شہر بتاں، ہے کہ نہیں ہے

اے سچ! تری انگلی کو پکڑ کر ہی چلے ہم
منزل کا کہیں سچ میں، نشاں ہے کہ نہیں ہے

کشتی مرے کاندھے پہ ہے اور پوچھ رہا ہوں
حصے میں مرے آبِ رواں ہے کہ نہیں ہے

سامع تو سماعت سے ہوئے جاتے ہیں محروم
جو بولنے والی تھی زباں، ہے کہ نہیں ہے

ہر قصر کی تعمیر کی تاریخ ہے کنداں
بستی کے مکانوں میں زماں ہے کہ نہیں ہے

کر لے مرے خوابوں کو مرا دل، ہی مقفل
اس قفل میں اب اتنی سی جاں ہے کہ نہیں ہے

تنور پہ بیٹھی ہوئی ناری میں دہک ہے
یادوں کا مرے دل میں دھواں، ہے کہ نہیں ہے

منبر پہ کھڑے شخص! ذرا مجھ کو دکھانا
تسبیح پہ انگلی کا نشاں، ہے کہ نہیں ہے

گھڑیال کی گولائی میں، سوئی ہے سفر میں
اور پوچھتی ہے زیست رواں ہے کہ نہیں ہے

ہر بار گماں سے ہی یقیں ٹوٹا ہے غافر
اب میرے یقیں میں وہ گماں، ہے کہ نہیں ہے

غافر شہزاد

غزلیں

وہ اپنی چل تو چکے چال پوچھتے کیوں ہیں
زرہ ہے کوئی، کوئی ڈھال پوچھتے کیوں ہیں

بھلا میں ان کو بتاؤں گی حال کیا ہے مرا
یہ لوگ مجھ سے مرا حال پوچھتے کیوں ہیں

جو ہونے والی ہے اُس موت کا برس پوچھیں
میں جس میں پیدا ہوئی سال پوچھتے کیوں ہیں

کہیں کہیں تو ہُوا زلف کو وہ لمس نصیب
ہوا نے کیسے چُھوئے بال پوچھتے کیوں ہیں

یہ اُن کا خاص وطیرہ ہے، انکی عادت ہے
عدو نے پھینکا ہے پھر جال پوچھتے کیوں ہیں

انہیں تو علم ہے کب آنکھیں ہوتی ہیں لبریز
یہ آنسوؤں سے بھرے گال پوچھتے کیوں ہیں

شہید کون تھے اب جا کے ہم بتائیں انہیں
وہ اپنی ماؤں کے تھے لال پوچھتے کیوں ہیں

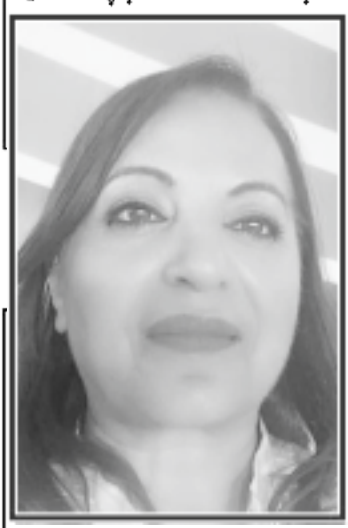

رخشندہ نوید

باتیں کریں جو مجھ سے مہرباں کے ہونٹ ہوں
ایسے نہ ہوں کہ پہرے پہ درباں کے ہونٹ ہوں

سختی سے بند دیکھ کے دروازے یوں لگا
جیسے کسی مرے ہوئے انساں کے ہونٹ ہوں

جب بھی چھوئے گلابی کہیں دیکھ کر گلاب
ہر پھول یوں لگا کہ گلستاں کے ہونٹ ہوں

میں چاہتی ہوں پھر سے گلے اس کے جا لگوں
پھر سے وہ ماتھا چُومے، مری ماں کے ہونٹ ہوں

ان راستوں پہ دیکھی، سنی گھنٹیوں کی چیخ
ممکن ہے دشت میں وہ ہُدی خواں کے ہونٹ ہوں

غزل

نہیں لگتی ہیں یہ انجان، خوابوں سے بھری آنکھیں
کہ رکھتی ہیں مری پہچان، خوابوں سے بھری آنکھیں

میں اِن میں ڈوب کر ہر ایک کلفت بھول جاتا ہوں
مری راحت کا ہیں سامان، خوابوں سے بھری آنکھیں

ہیں کتنی داستانیں، کتنے افسانے نہاں اِن میں
ہمارے دل میں ہیں مہمان، خوابوں سے بھری آنکھیں

یہی خوابوں بھری آنکھیں تمناؤں کا حاصل ہیں
ہیں میری عاشقی کا مان، خوابوں سے بھری آنکھیں

یہاں خوش رنگ نظارے بھی ہیں وحشت کے منظر بھی
نہیں ہیں بے سر و سامان، خوابوں سے بھری آنکھیں

کہیں پھر رتجگوں سے نور آنکھوں کا نہ چھن جائے
نہ ہو جائیں کہیں ویران، خوابوں سے بھری آنکھیں

یہ میرے دل کی سب کیفیتوں کو بھانپ لیتی ہیں
عجب ہیں صاحبِ عرفان، خوابوں سے بھری آنکھیں

ندیم اِدراک و علم و آگہی کا نور ہے ان میں
یہی ہیں حاصلِ وجدان، خوابوں سے بھری آنکھیں

ریاض ندیم نیازی

غزل

تھوڑا سا ڈگمگائیے صاحب
رند بن کر دکھائیے صاحب

یوں نہ آنکھیں چرائیے صاحب
بات کھل کر بتائیے صاحب

اتنی جلدی بھی کوئی کھلتا ہے
ایک دو بار آئیے صاحب

ایک مدت سے میں کہاں گم ہوں
مجھ کو بھی ڈھونڈ لائیے صاحب

بھول جانا بھی اک ہنر ہی تو ہے
بھول جانا سکھائیے صاحب

داد دوں گا بہ طرز غالب میں
میر کے شعر گائیے صاحب

آپ دانش کو یاد رکھیں گے
اک دفعہ ملنے آئیے صاحب

اعجاز دانش

غزلیں

عداوتوں کی نئی شکل میں لکیر چلا
کمان کھینچ ذرا، پھر سے مجھ پہ تیر چلا

ہر ایک بزم سے مِلتی نہیں ہے دادِ سُخن
چلی نہیں جو غزل تیری، شعرِ میر چلا

یہ حکم دے کہ پھریں، عشق میں گریباں چاک
کوئی تو رسمِ جنوں، شہر کے امیر چلا

تجھے مَیں بزمِ تصوّف میں لے کے چلتا ہوں
کِسی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر چل آ

گئے دِنوں کے بُھلا دے مُعاملات سبھی
نہ مجھ پہ طنز کے یُوں نشترِ حقیر چلا

اُسے غرض ہی نہیں عیش گاہ دُنیا سے
اُچھالتے ہوئے سکّے، کوئی فقیر چلا

یہ دم درود، نیا حُسن پر اثر نہ کرے
کوئی پُرانا ہی تعویذ میرے پیر چلا

کِسی نے مُڑ کے نہ دیکھا، ہے کون خانہ بدوش
اُٹھائے رختِ سفر کوئی راہ گیر چلا

ہر ایک سمت ہی چرچے ہیں آفتاب ترے
کہ جو ہے دستِ ہنر میں، وہی اخیر چلا

آفتاب خان

ظلم پر خاموش رہ لوں، کیوں ریاکاری کروں
کِس لیے آخر مَیں، ظالم کی طرف داری کروں

تخت پر بیٹھا ہوں گر، تو حکم بھی میرا چلے
مَیں ہوں زندوں میں اگر، فرمان خود جاری کروں

اِس کے دم سے میرا شملہ آج تک اونچا رہا
بیچ کر اپنی حویلی کیسے سرداری کروں

فیصلہ ہوتا کہاں ہے، تیر سے اور ڈھال سے
جیتتی ہے جنگ تو، تلوار دو دھاری کروں

ہوش مندی سے گزارش ہے، مجھے تم روکنا
جس گھڑی اپنے بدن پر وحشتیں طاری کروں

کر نہ پایا ہے مجھے، زیر نگیں کوئی کبھی
آ مگر اے حُسن، تیری ناز برداری کروں

لے تو آیا ہے مجھے بازار میں میرا نصیب
جیب میں سکّے نہیں، کیسے خریداری کروں

سرد کمرے میں چلا آیا ہے یادوں کا ہجوم
اُس کی تصویریں چُھپا کر، بند الماری کروں

روشنی کا استعارہ بن گیا ہُوں آفتاب
میں اندھیرے کے بُنوں سے، کِس طرح یاری کروں

غزل

محبت سے مکرنے پہ شریعت میں سزا کیا ہے
اگر دل ہی نہیں مانے تو پھر حکمِ خدا کیا ہے

فقیہِ وقت بتلائے عمل کی حد کہاں تک ہے
تصوف میں فقیری کیا، ولایت میں گدا کیا ہے

کہیں بھرتے نہیں دیکھے یہ کاسے بدگمانی کے
اَنا کے قید خانے میں فنا کیا ہے، بقا کیا ہے

یہ دل جو در بہ در بھٹکے فقط اِک نام کی خاطر
یہ نسبت ہے کہ سودا ہے، یہ سر کیا ہے، ردا کیا ہے

تعلق جڑ نہ پائے تو گروہ عاشقاں کیسا؟
تو پھر سجدہ کے کیا معنی، ریاضت کیا، دعا کیا ہے

سعدیہ بشیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اس لیے مجھ سے خفا ہے کوئی
اس کا ہوتے ہوئے خوددار ہوں میں

غزلیں

جہاں سے ابر کے امکاں مٹائے جاتے ہیں
ہم ایسے دشت میں پودے لگائے جاتے ہیں
جہاں عدم بھی گزرنے سے ہچکچاتا ہے
ہم اس جہان میں امکاں بسائے جاتے ہیں
ہمارے چشمۂ فرہاد کب کے سوکھ چکے
ہمیں پہ تیشے مگر آزمائے جاتے ہیں
جو آسمانِ وفا سے الجھ کے گر جائیں
وہی زمینِ وفا پر سجائے جاتے ہیں
ہمیں بناتی ہے خانہ بدوش ریگِ حیات
ہمارے شہر میں صحرا بسائے جاتے ہیں

ہم اپنی مرضی سے بنتے ہیں حرفِ نو اور پھر
بھلائے جاتے ہیں لکھ کر مٹائے جاتے ہیں
ہماری رات میں وحشت اجالنے کے لیے
چراغ طاقِ ہوا میں جلائے جاتے ہیں!!
جنھیں ہماری طرف دیکھ کر ہو تم ناخوش
وہ آس پاس تمھارے بھی پائے جاتے ہیں

افتخار الحق

معانی کی فراوانی نہیں ہے
کوئی مہمل بھی لایعنی نہیں ہے
میں سب کچھ سوچ کر پھر سوچتا ہوں
جو آسانی ہے آسانی نہیں ہے
نہ کھونے اور نہ پانے کا نتیجہ
پریشاں ہوں پریشانی نہیں ہے
جیوں اے کاش میں بھرپور جیون
کہ پھر باری مری آنی نہیں ہے
مقدر دیکھ کر حیرت ہے جتنی
مجھے اتنی پریشانی نہیں ہے

جو قدموں کو ملیں آنکھیں تو جانا
کوئی بھی راہ انجانی نہیں ہے
کھڑے ہیں در پہ تیرے احتراماً
ہمارا کام دربانی نہیں ہے
یہ لکھوائے گا لاتعداد نوحے
وصیت دل نے لکھوانی نہیں ہے
کھڑا ہوں زیست کے دریا میں لیکن
مرے پیروں تلک پانی نہیں ہے

غزلیں

ایک مدّت سے خدا جانے کہاں روپوش ہوں
وہ مجھے آواز دیتا ہے مگر خاموش ہوں

وہ سخن ساز اچھا سامع ہی سمجھتا ہے مجھے
میں مسلسل دیکھنے کے شوق میں خاموش ہوں

لڑکھڑانے سے توازن کھو گیا ہے معذرت!
گرچہ ٹکرایا ہوں لیکن واقعی نردوش ہوں

میں کوئی آواز سننے کے لیے اک عمر سے
شور و غل کے درمیاں رہ کر ہمہ تن گوش ہوں

جب کسی سرشار لمحے میں مقیّد ہو گیا
میرے بارے میں کہا جانے لگا مے نوش ہوں

عکس میں جنبش ہوئی ہے ایک لحظے کے لیے
آئنہ حیراں بہت ہے میں فقط بے ہوش ہوں

آپ اطمینان سے سو جائیں صدیاں تان کر
شاہد اشرف میں پرانے غار کی آغوش ہوں

شاہد اشرف

اک زمانے سے بھاگتا ہوا میں
واپس آیا نہیں ، گیا ہوا میں

دھیان سے میں اتر گیا اس کے
اپنے ہی دھیان میں پڑا ہوا میں

اپنی نظروں سے ہو گیا اوجھل
پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتا ہوا میں

دھوپ نکلی ہے ہلکی بارش میں
بھیگ جاتا ہوں سوکھتا ہوا میں

ڈھونڈتا ہوں کسی شناسا کو
راستے میں کہیں کھڑا ہوا میں

میں کسی کو دکھائی دیتا نہیں
آئنے میں کہیں چھپا ہوا میں

اس نے دھکا دیا مجھے شاہد
دھول کو جھاڑ کر کھڑا ہوا میں

غزل

روبرو اپنی ذات کی جائے
آج ایسے بھی رات کی جائے

شب کو آتا نہیں ہے چاند اگر
کیوں نہ جگنو سے بات کی جائے

آرزو ہے کہ جتنی باقی ہے
سنگ تیرے حیات کی جائے

دوست کرتے رہے ہیں ہم سے جو
اُن سے بھی واردات کی جائے

منصفوں سے کہو کہ اگلی بار
جیت میری نہ مات کی جائے

محمد دلشاد رانا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بند دروازہ تھا خالد ، یا عبادت گاہ تھی
اس کے دَر پر سارے بے کس، سارے بے گھر سو گئے

غزل

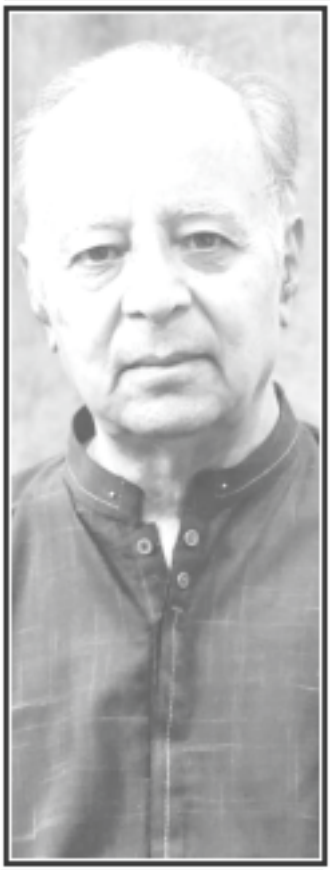

ایک ہی جگنو رات کی تاریکی کو بیوہ کر سکتا ہے
بس اِک جملہ انساں کو محفل میں تنہا کر سکتا ہے

وصل کی لذت ضبط کی حد میں پیار کو زندہ رکھتی ہے
کوئی بھی لمحہ چاہت میں دونوں کو رسوا کر سکتا ہے

رات کی باتیں بستر کی شکنوں سے پڑھ لی جاتی ہیں
خواب میں رونا بھی اکثر تکیے کو گیلا کر سکتا ہے

رنگ برنگے جسموں کی تحریریں کچھ بھی کر سکتی ہیں
ایسے میں کمزور سا لمحہ آنکھ کو میلا کر سکتا ہے

بھوک بغاوت کر بیٹھے تو خود ہی کو کھا جاتی ہے
آنکھ سے نکلا پیاسا آنسو دشت کو دریا کر سکتا ہے

سمیع اللہ عرفی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شہرِ عمل میں بھاگتے لمحوں کے ساتھ بھاگ
خالد حصارِ فکر سے باہر نکل کے آ

غزل

ہم نے ترے مزاج میں ڈھلنا تو ہے نہیں
سچ ہے کہ اپنا ساتھ بھی چلنا تو ہے نہیں

گرتے رہیں گے چاہے ہوں ہموار راستے
مدہوشیوں نے اپنی سنبھلنا تو ہے نہیں

ہم لاکھ اپنی آگ کی لو تیز تر کریں
ان پتھروں نے پھر بھی پگھلنا تو ہے نہیں

تم اپنی سطوتوں کی نمائش کرو ہزار
ہم سے زمین زادوں نے جلنا تو ہے نہیں

کرتا پھرے وہ جھوٹ کا پرچار ہر جگہ
لیکن یہ سکّہ شہر میں چلنا تو ہے نہیں

وہ جانتا ہے اس لیے کرتا ہے ظلم و جور
لوگوں نے اپنے گھر سے نکلنا تو ہے نہیں

اصغر علی بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پانی اُتر گیا ، مگر آنکھیں بجھا گیا
سیلِ جمال اپنا نشاں تک مٹا گیا

غزل

جان پہچان بنانے کے لیے کافی تھی
دوستی یاری زمانے کے لیے کافی تھی

پڑ رہی ہے یہ بہت کم کسی کی چاہت میں
عمر جو نام کمانے کے لیے کافی تھی

چار ہو کر بھی وہی کام کیا کرتی ہیں
ایک ہی آنکھ نشانے کے لیے کافی تھی

اتنی ہی تجھ سے تھی درکار محبت مجھ کو
یہ ترا ہجر کمانے کے لیے کافی تھی

چند پل ہنسنے ہنسانے میں گزارے ورنہ
زندگی اشک بہانے کے لیے کافی تھی

اس لیے بھی وہ پلٹ کر نہیں آیا ملنے
اک ملاقات نسانے کے لیے کافی تھی

بے وفائی تھی قمر وہ بھی تھی اک ساعت کی
ہاں مگر آنکھ چرانے کے لیے کافی تھی

قمر بشیر

غزل

لگ کر گلے سے ہم ترے روئیں گے اور کیا
اشکوں کو کشتِ شام میں بوئیں گے اور کیا

جب ختم ہو گا جاگتی راتوں کا یہ سفر
سر پر زمین کھینچ کے سوئیں گے اور کیا

ہر ذرّے کو سمیٹ کے لائے ہیں قبر تک
اپنے بدن کے بوجھ کو ڈھوئیں گے اور کیا!

گھر کے سوا بھی جائے اماں ہونی چاہئے
تیرے بدن میں خود کو سموئیں گے اور کیا

رکھا ہے اپنی آنکھ کا پانی سنبھال کر
دل پر لگی سیاہیاں دھوئیں گے اور کیا

یہ جو محبتوں کے سبھی دعوے دار ہیں
اک دن یہی بھنور میں ڈبوئیں گے اور کیا

اتنی طویل عمر کی خواہش نہیں فگار
چہرے کے رنگ و نقش ہی کھوئیں گے اور کیا

سلیم فگار

غزل

ماہ روشن نہ سہی ٹوٹتا تارا ہی سہی
ہم تو عادی ہیں خسارے کے خسارہ ہی سہی

کارواں لوٹ گئے خاک ہوئی محفل شب
اب تسلی کو غم دل کا سہارا ہی سہی

چاند ڈوبا تو چلو پیار اندھیرے سے کریں
تجربہ ہو گا نیا ، عشق دوبارہ ہی سہی

ہم کہ محروم رہے وصل کے ہر موسم سے
اس کو تعبیر ملی خواب ہمارا ہی سہی

ہم سر راہ وفا اب بھی کھڑے ہیں عابد
خواب ٹوٹے ہیں تو یادوں کا سہارا ہی سہی

عابد خان عابد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سوچو تو کچھ نہ سمجھو ، سمجھو تو کچھ نہ بولو
پھر چپ کا حسن دیکھو ، بیکار لب نہ کھولو

غزل

دکھائی جو دیتا ہے ہوں سادہ زیادہ
مجھے وقت نے ہے خرادہ زیادہ

زمانے کے ظُلم و سِتم سہتے سہتے
یہ دل ہو گیا ہے کُشادہ زیادہ

اُسی کے قدم چُومتے ہیں ستارے
تجسّس کا ہو جس میں مادہ زیادہ

اِسی خوف سے کچھ طلب کر نہ پائے
مُبادا مِلے کم مُبادا زیادہ

رہے شاہ رستے میں آرام کرتے
سفر کر گئے پاپیادہ زیادہ

اگرچہ مُیسّر بُہت تھے مواقع
نہ کر پائے ہم استفادہ زیادہ

کیا میرے یاروں نے ہی راجا نیّر
مِری خواہشوں کا بُرادہ زیادہ

راجا نیّر

غزل

وہ بُت بنا ، نگاہ جمائے کھڑا رہا
میں آنکھ بند کرکے اُسے پوجتا رہا

خوش فہمیوں کا آج بھرم کُھل گیا تو کیا
اک موڑ پر تو اس کا مرا سامنا رہا

تم کو تو ایک عُمر ہوئی ہے جُدا ہوئے
حیراں ہوں رات بھر میں کسے ڈھونڈتا رہا

ایک اک دریچہ بند تھا پھر بھی یہ ڈر رہا
چُھپ چُھپ کے جیسے کوئی مجھے جھانکتا رہا

اس کی نگاہ فتنہ ادا تو بہانہ تھی
خود میرا دل بھی میرا لہو چاٹتا رہا

انجم میں انتظار کی آتش میں جل گیا
کل جلتی دوپہر میں اکیلا کھڑا رہا

انوار انجم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھا نہ ہمیں تُو خط و خال سے آگے
اِک شہر تھا ، اِس شہرِ مہ و سال سے آگے

غزل

آصف شفیع

تقسیم کو خاندان آیا
جب تیسرا درمیان آیا

مشکل جو پڑی تو دوستوں کو
مجھ سے ملنے کا دھیان آیا

سب راکھ جو ہو چکا زمیں پر
تب ہوش میں آسمان آیا

اک روز میں حسن سے ملا ، پھر
سب رازِ عشق جان آیا

دشوار بہت تھی عشق کی راہ
ہر گام ہی امتحان آیا

جب آخری سانس لے چکا میں
تب جا کے مہربان آیا

پھر وصل کا اک غبار اٹھا
اک ہجر کا کاروان آیا

آباد ہوا جو دشت آصف
شورِ آشفتگان آیا

غزل

آنکھ مل جائے مجھے ایسی نظر مل جائے
میں جدھر دیکھوں مجھے تیری خبر مل جائے

فن کو گہرائی ملے حضرتِ غالب جیسی
میر جیسا مرے شعروں کو اثر مل جائے

اپنی دیوار کے سائے کی فقط حسرت ہے
بس یہی ایک تمنا ہے کہ گھر مل جائے

یہ بھی ممکن ہے کہ موجود ہو چشمہ کوئی
یہ بھی ممکن ہے کہ رستے میں شجر مل جائے

دربدر جس کی طلب میں ہے جبینِ سجدہ
بات بن جائے اگر مجھ کو وہ دَر مل جائے

باندھ رکھو یہاں سامانِ سفر بے خبرو
جانے کس وقت تمھیں اِذنِ سفر مل جائے

میں شبِ وصل کی اُمید لیے نکلا تھا
کب یہ چاہا تھا کہ رستے میں سحر مل جائے

دار کی سمت نکل آؤں میں ہنستا گاتا
مجھ کو کھویا ہوا شانوں پہ جو سر مل جائے

زخم سینے کا اُبھر آئے مرے ماتھے پر
غم کی توقیر ملے ایسا ہُنر مل جائے

وہ طبیعت کو گوارا تو نہیں پھر بھی نبیل
اُس سے ملنا تو نہیں میں نے مگر مل جائے

نبیل احمد نبیل

غزل

رابطے خوب رہے شام و سحر لوگوں سے
پھر بھی سیکھے نہیں جینے کے ہنر لوگوں سے

دل کے رستے پہ لگا رہتا ہے آنا جانا
کتنی آباد ہے یہ راہ گزر لوگوں سے

میرے کردار پہ کل انگلی اٹھانے والا
خود ملا سکتا نہیں آج نظر لوگوں سے

اپنے سائے میں کسی کو نہیں رکنے دیتا
یوں گریزاں ہوا اس بار شجر لوگوں سے

فیصلے ایسے کرو گے تو اُجڑ جائے گا
شاد و آباد جو لگتا ہے نگر لوگوں سے

بحر آنسو کی طرح آنکھ سے بہ نکلا ہے
نم چھپاتے پھرو اب دیدہ تر لوگوں سے

یہ تو کعبہ میں بھی رکھتے نہیں اوروں کا خیال
جان پیاری ہے تو پھر بچ کے گزر لوگوں سے

یوں نہ سب ٹھیک کا فرمان سنایا ہوتا
آپ اک بار ملے ہوتے اگر لوگوں سے

تو وہ کانا ہے جو اندھوں میں گرا رہتا ہے
تجھ کو ملنا ہے تو مل اہل نظر لوگوں سے

عشق نے کر دی ہے شمشیر وہ حالت میری
آج کل ملتی ہے اپنی بھی خبر لوگوں سے

شمشیر حیدر

غزل

قیمتی کوئی نگیں دیکھتے دوست
تم اگر زہرہ جبیں دیکھتے دوست

اک امانت جو سنبھالی ہوتی
نسل در نسل امیں دیکھتے دوست

تجربہ آؤ نیا کرتے ہیں
آسماں سے ہیں زمیں دیکھتے دوست

یہ تو ہم ہارے نہیں دنیا سے
تم ہمیں حجرہ نشیں دیکھتے دوست

مجھے اپنا کوئی دکھ تو نہیں پر
تم کبھی میرا یقیں دیکھتے دوست

حال کیا دشمنوں کے ظرف کا اب
جب تعلق بھی نہیں دیکھتے دوست

در گزر کرنا ہی پڑتا ہے قمر
اتنی باریکی نہیں دیکھتے دوست

قمر نیاز

غزل

کوئی مکاں بھی اگر لامکاں سے آگے ہے
حصارِ وقت نہ حدِ گماں سے آگے ہے

سفر شروع ادھر سے کریں تو دیکھیں گے
بلندیوں میں زمیں آسماں سے آگے ہے

بتا گئے ہیں ہمیں ساتھ چھوڑنے والے
کہ منزلوں کی طلب ہمرہاں سے آگے ہے

وہ جس کے پیچھے چلے جا رہے ہیں برسوں سے
کوئی بتائے کہ ہم سے کہاں سے آگے ہے

کسی مقام کسی زاویے سے بھی دیکھیں
ہمارا دوست صفِ دشمناں سے آگے ہے

زیادہ وقت نہیں گزرا ہے کہ پیچھے تھے
یہ ایک نہر جو تشنہ لباں سے آگے ہے

ابھی تو خیر شروعات ہیں محبت کی
پڑاؤ پہلا ہی سود و زیاں سے آگے ہے

ہیں سنگِ میل کی صورت یہ خواب منزل کے
نیا نشان بھی پہلے نشاں سے آگے ہے

اڑان بھرنا بھی آساں نہیں رہا جاذب
یہاں ٹھہرنا بھی تاب و تواں سے آگے ہے

اکرم جاذب

غزل

کچھ سفید اور کچھ وہ نیلے تھے
سب مگر میری شکل جیسے تھے

روشنی تھی کہ نور بکھرا تھا
در و دیوار جاگ اٹھے تھے

پیڑ پر شور تھا پرندوں کا
خواب جیسے کسی کے ٹوٹے تھے

آنسوؤں سے لگائی تھی مہندی
اُس ہتھیلی کے رنگ پھیکے تھے

تیز آندھی میں گر گئے وہ بھی
جن درختوں کے گھر میں سائے تھے

اک پری کا خیال آتے ہی
دل کے آنگن میں پھول کِھلتے تھے

اُس کا چہرہ کِھلا ہوا تھا ظہور
میرے کمرے میں رنگ بکھرے تھے

ظہور چوہان

غزلیں

حالتِ بے سروسامانی نہیں جاتی ہے
اس بھرے دشت کی ویرانی نہیں جاتی ہے

شامِ افسوس نکلتے ہوئے پہلو سے ترے
کیا ہوا تھا کہ پشیمانی نہیں جاتی ہے

جن کو جلنا ہے سرِ راہِ محبت ہر دم
ان چراغوں کی نگہبانی نہیں جاتی ہے

ناصر علی ناصر

عشق تیرا جو میری ذات کا دھارا بنتا
میں بھنور میں بھی اترتا تو کنارا بنتا

درد بچے کی سی حیرت سے کھڑا دیکھتا ہے
کاش سینے میں کسی آہ سے تارا بنتا

ایسا لگتا ہے میرے نقش ادھورے ہیں ابھی
تُو مجھے چھوڑ نا جاتا تو میں سارا بنتا

کیسے منظر ہیں جو لپٹے ہیں مری آنکھوں سے
روبرو کیا ہے کہ حیرانی نہیں جاتی ہے

مسئلہ یہ ہے کہ خود سر ہوں بلا کا ناصر
کوئی بھی بات غلط مانی نہیں جاتی ہے

وہ جو تم سامنے بیٹھے تھے زمانے سے جدا
ایسا منظر میری آنکھوں میں دوبارا بنتا

نفرتیں ساری جلانے کی تمنا تھی مجھے
کوئی آنسو میری آنکھوں میں شرارا بنتا

غزل

رات باقی ہے کون آئے گا
آ کے در تیرا کھٹکھٹائے گا

بو دیئے بیج ہم نے چاہت کے
جابجا پیار لہلہائے گا

روٹھنا تو تمھاری عادت ہے
کون آ کر تمھیں منائے گا

آج مہمان بنیں گے ہم اُس کے
جو ہمیں پیار سے بلائے گا

ایک نیکی اسے ملے گی ضرور
جو کوئی روتے کو ہنسائے گا

تیرے کوچے میں کیوں کھڑا ہے نبیل
ہر کوئی انگلیاں اٹھائے گا

نبیل قیصر

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

راستے بھر کیا یونہی ہم کو پکارے جائیں گے
ساتھ دریا کے کہاں تک یہ کنارے جائیں گے

غزل

کسی مکاں کا مکیں دیر تک نہیں رہتا
کوئی بھی تخت نشیں دیر تک نہیں رہتا

اسے کہو یہ خدوخال ایک دھوکا ہیں
کوئی بھی شخص حسیں دیر تک نہیں رہتا

ہمارا ہونا نہ ہونے سے مختلف تو نہیں
گمان کیا ہے، یقیں دیر تک نہیں رہتا

ہم ایک بیج کو مٹی میں ڈال دیتے ہیں
کوئی بھی زیرِ زمیں دیر تک نہیں رہتا

منافقت کا یہاں کاروبار چلتا ہے
صداقتوں کا امیں دیر تک نہیں رہتا

میں جب بھی حلقۂ جاں سے گزر کے آتا ہوں
مرا پڑاؤ کہیں دیر تک نہیں رہتا

نوید وادیٔ انکار سے گذر کر بھی
ترے لبوں پہ نہیں دیر تک نہیں رہتا

محمد نوید مرزا

غزل

رسمِ اُلفت ادا کرے گا کون ؟
باوفا سے وفا کرے گا کون ؟

دردِ دل حد سے بڑھ گیا اب کے
دردِ دل کی دوا کرے گا کون ؟

جس میں شامل نہ ہو ریاکاری
ایسا سجدہ ادا کرے گا کون ؟

کوئی رکھتا نہیں متاعِ ہجر
وصل کے دل میں جا کرے گا کون ؟

خود سے ملنے کی جستجو ، معدوم
آنکھ باطن کی وا کرے گا کون ؟

سانس لینا گراں ہوا ہے یہاں
زندگی کی دعا کرے گا کون ؟

بے نیازی ہے اُس کی خُو تو جمیلؔ
جرأتِ اِلتجا کرے گا کون ؟

جمیل حیات

غزل

یوں خواب بن کے آنکھ میں آیا نہ کیجیے
پھر دل کو حسرتوں میں جلایا نہ کیجیے

اک زخم دل میں اور اُبھر آئے گا ابھی
یوں نام لے کے ہم کو بلایا نہ کیجیے

ہم کو خبر ہے دل میں تمہارے ہے کیا چھپا
یوں جھوٹ موٹ ہم کو بتایا نہ کیجیے

جو بات دل میں ہے وہی کہہ دیجیے حضور
لفظوں کو اس طرح تو گھمایا نہ کیجیے

ہم نے فریب کھائے بہت قربتوں سے بھی
یوں پیار سے قریب تو آیا نہ کیجیے

ہم سے بچھڑ کے آپ بھی تنہا رہیں گے کیا
یہ سوچ کر ہمیں یوں ستایا نہ کیجیے

ہم کو ہمارے حال پہ اب چھوڑ دیجیے
یوں بار بار دل کو دکھایا نہ کیجیے

جبرانؔ دل کا حال چھپانا محال ہے
یوں سامنے سے آنکھ چرایا نہ کیجیے

وسیم جبران

غزل

بے حسی سی بے حسی ہے
جانے کیسی زندگی ہے

جل رہا ہے گھر جو میرا
دوستوں کی دشمنی ہے

ہر طرف ہے ہو کا عالم
رات جیسے رو رہی ہے

کیسے میں دامن بچاؤں
آگ مجھ کو ڈھونڈتی ہے

کیا ہے یہ دل کی اداسی
اک عجب افسردگی ہے

ایک سا ہے رنگ خوں کا
موت ہی اب زندگی ہے

خواب رستہ دیکھتے ہیں
نیند شب بھر جاگتی ہے

رنگ دیکھو آسماں کا
سرخ سی اک روشنی ہے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

موجِ خوں بن کر دلِ حساس سے اچھلیں گے کب؟
ہم درِ اظہار سے کس دن گزارے جائیں گے

غزل

فرصت ملے تو جھانکنا دل کی حدود میں
میلا لگا ہوا ہے جہانِ وجود میں

آنے لگا ہے مجھ کو بڑی دور تک نظر
اک ارتعاش پیدا ہوا ہے جمود میں

جائیں گے ہم عدن میں بڑے اہتمام سے
بخشش خدا نے رکھی ہوئی ہے درود میں

دنیا کھڑی ہوئی ہے ترے انتظار میں
درکار کتنا وقت ہے تجھ کو نمود میں

دنیا سے منفرد ہے ترے بھائی کا مزاج
نوحہ سنائی دیتا ہے مجھ کو سرود میں

پھیلا رہے ہیں اپنی صفوں میں بغاوتیں
ایسے بھی چند چہرے ہیں اپنے جنود میں

اسد رضا سحر

غزل

شام سے پہلے لوٹ کے گھر کو آ جانا
ورنہ لوگ کہیں گے تم کو دیوانہ

تیرے بن ہم کیسے وقت گزاریں گے
مشکل ہے اب تنہا دل کو بہلانا

دل تو سلگ رہا ہے شمع کی مانند
دیکھیے کب آتا ہے بھول کے پروانہ

آؤ ہم بھی مل کر پینے چلتے ہیں
شہر سے باہر آج کھلا ہے میخانہ

بیتے دنوں کو بھول ہی جانا اچھا ہے
بھولی بسری یادوں کو کیا دہرانا

سائیں سائیں کی آوازیں آتی ہیں
دل ہے میرا یا ہے کوئی ویرانہ

بادل اب کے کھل کے برسیں ہیں اشفاق
اشکوں کا کیا خوب دیا ہے نذرانہ

محمد اشفاق بیگ

غزل

میتھیو محسن

دیپ کس کس کا نہ جلتا ہوگا
جب سنور کر وہ نکلتا ہوگا

نام کے ساتھ جو لکھے دریا
پھر وہ رستہ بھی بدلتا ہوگا

وہ مجھے چھوڑ گیا ہے لیکن
اب کبھی ہاتھ تو ملتا ہوگا

حسن پر اتنا بھی مغرور نہ ہو
چڑھتا سورج بھی تو ڈھلتا ہوگا

اب جو اُڑتا ہے ہوا میں محسن
وہ زمیں پر کبھی چلتا ہوگا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اس طرح پھوٹ کے رویا کوئی
بے کسوں کا نہیں گویا کوئی

غزل

‘جل بھی رہا ہوں عشق میں جی بھی رہا ہوں میں’
زہراب زندگی کو الگ پی رہا ہوں میں

جل بھی گیا ہوں خیر سے شعلوں میں عشق کے
نکلے نہیں ہیں بل مرے رسّی رہا ہوں میں

معصوم جان کر نہ ستا عشق میں مجھے
معشوق دلرُبا ترا جانی رہا ہوں میں

آنسو سمجھ کے مجھ کو گراتے ہو کیوں عبث
آخر تُمھاری آنکھ کا پانی رہا ہوں میں

عارضؔ پہ کر نظر نہ عداوت سے یار تُو
کل تک کسی کی آنکھ کی مستی رہا ہوں میں

سرفراز عارض

زندگی کے ہاتھ میں تو ہاتھ دے دیں گے، مگر
وحشتوں کے پاؤں میں کیا خاک پہنائیں گے ہم

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

غزل

محمد علی ایاز

کوئی بھی ہاتھ نہ کانپا کبھی اٹھاتے ہوئے
کسی کے حصے میں آئی خوشی اٹھاتے ہوئے

سحر کی بانہوں میں آتے ہوئے تمام ہوئی
کسی چراغ کی لو زندگی اٹھاتے ہوئے

تمام لوگوں میں تقسیم کرتا جاتا ہوں
میں ایک نام سے کچھ روشنی اٹھاتے ہوئے

کسی کے حسن تکلم پہ وار آیا ہوں
میں گفتگو سے بھری خامشی اٹھاتے ہوئے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زر والوں کے ساتھ ہی خالد، بے زر بھی اُٹھ جاتے ہیں
ماہ و سال گزر جاتے ہیں، ایک گھڑی بچ جاتی ہے

غزلیں

بہت ذہین ہے جس کے دیئے ہوئے ہیں یہ دکھ
مرے لیے تو معمّہ بنے ہوئے ہیں یہ دکھ

ہمارے ساتھ ہی کھیلے ہیں ایک آنگن میں
بڑے ہوئے تو برابر بڑے ہوئے ہیں یہ دکھ

کبھی کبھی تو خدا بھی نظر نہیں آتا
ہماری سوچ سے بڑھ کر گھنے ہوئے ہیں یہ دکھ

جنہیں کمی ہیں وہ آئیں اٹھا کے لے جائیں
ہمارے پاس اضافی پڑے ہوئے ہیں یہ دکھ

مری شکست یقینی ہے اس تصادم میں
خوشی کے مدِ مقابل کھڑے ہوئے ہیں یہ دکھ

کہاں کہاں سے سمیٹے سمیٹنے والا
کہ سارے صحن میں عارض پڑے ہوئے ہیں یہ دکھ

آفتاب عارض

دریا کو بے کنار ، پہاڑوں کو دھول کر
مرضی ہے تیری کوئی سے رائج اصول کر

وہ خواب ہے تو خواب کی تصویر کھینچ لے
سچ مچ ملے تو کوئی نشانی وصول کر

گم ہوگئی ہے دھند کی آغوش میں سڑک
تو یاد آگیا ہے مجھے پھر سے بھول کر

اے یادِ یار مجھ سے ہنسی چھین کر مری
پھر سے اداس کر مجھے پھر سے ملول کر

لانا ہے بے بدن کو عدم سے وجود میں
تو ندرتِ خیال کی خوشبو کو پھول کر

دھوکا، فریب، جھوٹ، مکر، رنج عشق میں
عارض تبرکات سمجھ کر قبول کر

غزل

لگتا ہی نہیں عشق ، یہ ٹالے سے ٹلے گا
اِس دل کو دکھایا تو ، تمھیں پاپ لگے گا

اے شوخ نظر آتے ہوئے ،کوچے میں میرے
سوچا تو یہی ہوتا ، کہ کیا تیرا بنے گا

اک جیسا نہیں ہوتا ہے ، انجامِ محبت
جو ہاتھ چھڑائے گا ، وہی ہاتھ ملے گا

آنے سے ترے پہلے ہی ، معلوم تھا مجھ کو
اس دل کا نگر تو ، ترے آنے سے سجے گا

ممکن تو نہیں تھا، کہ ترے ہوتے ہوئے بھی
اشکوں کا مرے دیپ ، یہ دن رات جلے گا

پردیس میں کب تک یونہی، تم بیٹھے رہو گے
اک دن تو تمھیں لوٹ کے ، آنا ہی پڑے گا

تعویذ گلے باندھ کے تم پھرتے ہی رہنا
جادو مرے انداز، تکلم کا چلے گا

تُو سوچ ذرا سوچ ذرا ، سوچ ذرا تُو
اک میرے سِوا کون ترے ساتھ ، جچے گا

الماس شبی

غزل

تجھ سے پہلے تھا ہی کیا تصویر میں
پھول تھے کنکر نما تصویر میں

کیمرے سے اِس طرح تصویر لو
آ رہا ہو کیمرہ تصویر میں

دیکھتے ہی مجھ کو اُس تصویر کا
رنگ اڑنے لگ گیا تصویر میں

سب مناظر جا چکے اطراف کے
میں اکیلا رہ گیا تصویر میں

جس کی بنتی ہی نہیں کوئی جگہ
آ رہا ہے ہر جگہ تصویر میں

ایک لمحہ مسکرانے کے عوض
عمر بھر روتا رہا تصویر میں

نقش چوری ہو گئے راجا مرے
اس قدر چربہ ہوا تصویر میں

اویس راجا

غزل

شوق پردیس میں ، کمائی کا
باپ کا منہ نہ دیکھا بھائی کا

پوچھنے ایک ، بھی نہیں آیا
مان ٹوٹا یوں ، ست بھرائی کا

کچھ نہ کچھ ہر کسی میں سچ تو یہ
شوق ہوتا ہے خود نمائی کا

نیکو کاروں کا امتحاں ہے یہ
دور ایسا ہے بے حیائی کا

بول کس سے کروں بتا کیسے
ذکر تیری میں بے وفائی کا

بے نیازی بھی یوں نہیں اچھی
پاس رکھتے ہیں کچھ خدائی کا

آپ احساس کو لیے پھرتے
دور عاصم ہے یہ ڈھٹائی کا

عاصم بخاری

غزل

فرطِ جذبات میں، میں نے کیا کچھ کہا اور اُس نے مری سُن کے کی اَن سُنی
میں محبت کے پیماں کا طالب رہا اور اُس نے مری سُن کے کی اَن سُنی

زندگی کے کٹھن مرحلوں سے گزر کر مجھے گفتگو کا ہنر جب ملا
میں نے آغازِ گویائی اُس سے کیا اور اُس نے مری سُن کے کی اَن سُنی

میں اگر بولوں اور وہ نہ مجھ کو سُنے؟ محض الزام ہے اور کچھ بھی نہیں
کب مجھے بات کرنے کا موقع ملا اور اُس نے مری سُن کے کی اَن سُنی؟

اک طرف میں توجہ کا مرکز رہا دوسری سمت سہتا تغافل رہا
اک زمانہ ، کہ جس نے مکمل سُنا ، اور اُس نے مری سُن کے کی اَن سُنی

کاش وہ بھی کبھی میرے ہونٹوں کی حرکت سے نکلے ہوئے لفظ سُنتا ثمرؔ
پر نتیجہ ہمیشہ اُلٹ ہی رہا اور اُس نے مری سُن کے کی اَن سُنی

ثمر جمال

غزل

گلستانِ محبت میں کوئی تو دل رُبا ہو گا
مرے جذبوں، مری حسرت کو کوئی جانتا ہو گا

دعائے دردِ دل اس کے لیے بے سود ٹھہرے گی
تمنائے صنم میں جو کوئی نغمہ سرا ہو گا

تمھارے ہجر میں کیسی گھڑی ہم نے گزاری ہے!
کسی کو انتظار اتنا نہیں کرنا پڑا ہو گا

مرے اپنے، مرے اخلاص کو بے جا سمجھتے ہیں
مری فطرت میں شامل شیوۂ اہلِ رضا ہو گا

مرے سر پر ہمیشہ میری ماں جی کی دعائیں ہیں
مری قسمت میں اک دن دیکھنا ظلِّ ہُما ہو گا

نگاہوں نے ہمیشہ گردشِ حالات دیکھی ہے
مرا ہر شعر رودادِ دیارِ بے وفا ہو گا

فغانِ آہوانِ دشتِ تنہائی غزل میری
مرا حرفِ سخن بزمِ خرد میں لب کشا ہو گا

نجف میں جاؤں گی مسکان گل، مدحت سرا ہوں گی
مری آنکھوں کے آگے روضہء مشکل کشا ہو گا

مسکان گل

غزل

جہاں بھر سے جُدا گانہ، انوکھا بانکپن دیکھا
جہاں والو! جہاں میں ایسی چھب والا بجن دیکھا؟

چمکتی سُرمگیں آنکھیں، مہکتی عنبریں زلفیں
ہزاروں ناز دِکھلاتا، ہوا سیمیں بدن دیکھا

نسیمِ صُبح نے چُومے ہوں جیسے مُشک بُو گیسو
کہ مستی میں فضا دیکھی، تموّج میں چمن دیکھا

نہ پُوچھ اس پیکرِ خُوشتر کی دل آویز رعنائی
حریمِ ناز میں جاں زیب، اِتراتا ہرَن دیکھا

پرے چلمن سے 'دِل آرا' مری چشمِ تصوّر نے
تبسّم کی ضیا دیکھی، حیا کا پیرہن دیکھا

جمالِ فکر کے ہر نقش میں دیکھی فُسوں کاری
حُروفِ ناز کی تہہ میں نہاں، اِعجازِ فن دیکھا

جمالِ یار نے آخر کرم یہ ہم پہ فرمایا
کہ تنہائی میں بھی خود کو، شریکِ انجمن دیکھا

گنوا بیٹھے حواس اپنے، لُٹے ہم بَرسرِ محفل
اثر، کافر ادا کا ہم نے ایسا جاں شکن دیکھا

عجَب مُعجز بیانی ہے کہ اس کی ہر نگارش میں
ہمیشہ 'ہم نے اک دریائے معنی 'موج زن دیکھا

بیاں ''جمشید'' کیسے ہو، سراپا اس کا لفظوں میں؟
گُلوں کے درمیاں ہم نے، خراماں گُل بدن دیکھا!

جمشید کمبوہ

غزل

محبتوں کا اٹھاؤ کباڑ چلتے بنو
پڑی رہے مرے دل میں دراڑ ، چلتے بنو

وفائیں پیار و محبت اب اپنے پاس رکھو
دلوں کے بیچ لگا دی ہے باڑ چلتے بنو

میں آنے والا نہیں ہوں کسی بھی چنگل میں
لگاؤ پھر سے نہ کوئی جگاڑ چلتے بنو

تو مشکلات کا ساتھی کبھی سے تھا ہی نہیں
اٹھا ہی لوں گا میں یہ بھی پہاڑ چلتے بنو

تمھارے جبرِ مسلسل کا شاخسانہ ہے
دلوں کے بند ہیں سارے کواڑ چلتے بنو

کوئی بھی حیلہ، دوا و دعا نہ کام آئی
دیا ہے عشق نے فیصل بچھاڑ چلتے بنو

فیصل زمان چشتی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لوگ دیوانے ہوئے یا شہر ویرانے ہوئے
کُو بکُو یُوں دامنِ صد چاک لہراتے نہ تھے

غزل

رُتیں بدلنے لگیں غم گسار رونے لگے
جو تُو نہ آیا تو سب بے قرار رونے لگے

یہاں سے جاتے ہوئے سب کے سب بہت خوش تھے
اتر گئے جونہی دریا کے پار، رونے لگے

جو ایک دوجے سے ملتے تھے مسکراتے ہوئے
بچھڑتے وقت وہی زار زار رونے لگے

جو ہنس رہے ہیں تو اِن کی ہنسی غنیمت جان
یہ چُپ نہ ہوں گے اگر ایک بار رونے لگے

غموں نے حال ہی کچھ ایسا کر دیا تھا مِرا
کہ مجھ پہ ہنستے ہوئے میرے یار رونے لگے

ہمارے واسطے دنیا ہے اِک عزا خانہ
جہاں پہ آتے ہی بس بے شمار رونے لگے

کسی کو سوچ کے ہم مسکرا دیے تیمور
کسی کو دیکھ کے بے اختیار رونے لگے

سیّد تیمور کاظمی

غزلیں

اب ایسی بھی نہیں دھندلی ہماری آنکھ کی پتلی
دکھائی ہی نہ دے کس ہاتھ میں ہے کون سی پتلی
یہ جن کی انگلیوں پر ناچتی ہیں بس انھی کی ہیں
مگر بچے الجھتے ہیں، مری پتلی تری پتلی
ہمارا جی پرانی پتلیوں سے بھر گیا صاحب
تماشے کے لیے اب لائیے کوئی نئی پتلی
کسے معلوم اب پردے کے پیچھے چل رہا ہے کیا
کسے معلوم اب آتی ہے آگے کون سی پتلی
مداری دیکھنا کس کس طرح اس کو نچاتا ہے
اگر اک بار اس کی انگلیوں پر چڑھ گئی پتلی

ہماری پتلیوں میں تو گھڑی بھر دم نہیں پڑتا
یہ تم کیسے بنا لیتے ہو ہنستی کھیلتی پتلی؟
برا اچھا سبھی تو طے شدہ ہے اس تماشے میں
تماشائی تماشا گاہ میں ہے خود کوئی پتلی
اے وحشت! رقص فرما ہو، اے تنہائی! تماشا کر
بھرے میلے میں ہم سے پھر کسی نے پھیر لی پتلی
تھکن ہے ہاتھ کی پوروں میں دن بھر کے تماشے کی
اور اب تخلیق کرنی ہے ہمیں اک خواب کی پتلی

سجاد بلوچ

بس ایک بار اے ماہ تمام، آخری بار
دکھائی دے مجھے بالائے بام آخری بار

میں تھوڑی دیر میں معدوم ہونے والا ہوں
کلام کر مرے آئینہ فام، آخری بار

یہ میری یاد بھی ہو جائے گی فنا اک دن
زمیں پہ لے گا کوئی مرا نام، آخری بار

اڑائے گی کوئی ٹھوکر میری بچی ہوئی خاک
میں آؤں گا کسی وحشت کے کام، آخری بار

وہ کہہ رہا تھا کہ ہم زندگی کریں گے ساتھ
میں اس کے ساتھ تھا محو کلام، آخری بار

غزل

اِکتفا وقت کے مرہم پہ کیا چھوڑ دیا
ہم نے تھک ہار کے زخموں کو کُھلا چھوڑ دیا

دل نے چاہا بھی تو مُڑ کر نہیں دیکھا اسکو
ہم نے اِک بار جسے چھوڑ دیا چھوڑ دیا

تم سے قاتل کبھی زندہ نہیں چھوڑے جاتے
پھر بھی ہم نے تو فقط اِتنا کیا ''چھوڑ دیا''

ہم ہی ایمان پہ قائم رہے ورنہ اکثر
ایسے حالات میں لوگوں نے خدا چھوڑ دیا

ایک بھی شخص کو کمزور سہارا نہ دیا
ہاتھ کو تھام لیا ٹھیک سے یا چھوڑ دیا

اور پھر آپ کے آنگن میں نئے چاند اُترے
اور پھر آپ نے وہ بجھتا دِیا چھوڑ دیا

انس فرید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھ کب جھپکے گی، بکھرے گی یہ زنجیر کہاں
اے مرے خواب رواں! ہے تری تعبیر کہاں

غزل

لوگ چھوٹے بھی یہاں خود کو بڑا مانتے ہیں
اور سمجھائے اگر کوئی ، بُرا مانتے ہیں

شک نہیں ان پہ مجھے ، پختہ یقیں ہے لیکن
دل چرایا ہو جنھوں نے وہ بھلا مانتے ہیں

لاکھ سمجھاو ، انھیں فرق نہیں پڑتا کچھ
عشق والے تو میاں دل کا کہا مانتے ہیں

شر پہ مائل ہے اگر وہ تو پھر حیرت کیسی
ہم نے احسان کیا ہے یہ خطا مانتے ہیں

کچھ تو ایسے ہیں جو پتھر کو سمجھتے ہیں خدا
اور کچھ وہ ہیں جو پیسے کو خدا مانتے ہیں

حبس جاں کی یہ کماں ٹوٹی ہے تجھ سے مل کر
اس لیے ہم ترے لہجے کو صبا مانتے ہیں

آج بھی حرفِ وفا یاد ہے عاجز سو ہم
زخم جو تم نے دیئے اُن کو دوا مانتے ہیں

نوید عاجز

غزل

رخسانہ سمن

دیے جلائے ، خزاں کو بہار کس نے کیا
مجھے خبر ہے مرا انتظار کس نے کیا

یہاں کی خاک تو صحرا کے خاندان سے تھی
ہر اک درخت یہاں سایہ دار کس نے کیا

ترے علاوہ مرے شیشہ گر بتا مجھ کو
ہمارے جسم کے دریا کو پار کس نے کیا

شکست کھا کے بھی لہجے میں اک توازن تھا
ہماری جیت کو آخر میں ہار کس نے کیا

دھنک کے رنگ چھپائے ہیں کس نے پلکوں میں
وجودِ خواب پہ نقش و نگار کس نے کیا

ہوائے زرد کے آگے کھڑا ہے شان کے ساتھ
ترے چراغ کو یوں پائیدار کس نے کیا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جذبوں کے بادل لائیں گی یا رُوح بیچ کر جائیں گی
کیا جانئے کس سمت سے کیسی ہوائیں آئیں گی

غزلیں

بھر بھرے جسم کی مٹی کا جو چارا نہ بنے
کوزہ گر مجھ سا ترے چاک پہ گارا نہ بنے

فائدہ کیا ہے ترے دستِ ہنر کا مجھ کو
کسی ذرے سے اگر کوئی ستارا نہ بنے

شام کو جس کا چراغوں سے اُجالا کم ہو
وہ شبِ غم میں مری آنکھ کا تارا نہ بنے

اُس سے تو ہاتھ چھُڑا لینا بہت بہتر ہے
ساتھ چلتے ہوئے جو شخص سہارا نہ بنے

یار اُس شخص پہ افسوس بہت ہوتا ہے
وہ جو دنیا کا بنے اور ہمارا نہ بنے

عمر بھر جس نے مجھے دھوکے میں رکھا ہے لطیف
اُس سے کہنا مری نظروں کا نظارا نہ بنے

میاں مزمل لطیف

زمانہ ایسے چلتا جا رہا ہے
کہ سب کچھ ہی بدلتا جا رہا ہے

وصالِ یار نے وہ آگ بھر دی
بدن بارش میں جلتا جا رہا ہے

ہماری سانس کتنی ریشمی ہے
سرا سب سے پھسلتا جا رہا ہے

کوئی حسرت تو ہے سورج کے دل میں
کہ صدیوں سے پگھلتا جا رہا ہے

تو حاصل تھا تو وہ بھی کتنا خوش تھا
بچھڑ کر ہاتھ ملتا جا رہا ہے

تجھے دیکھا ہے جب سے آنکھ بھر کے
یہ دل ہے کہ مچلتا جا رہا ہے

غزل

بسی ہوئی ہے اِک خوشبو مرے ارماں کے پہلو میں
عجب اک حشر برپا ہے دلِ ناداں کے پہلو میں

کئی یادوں کے چہرے واہموں کی اوٹ میں گم ہیں
پرانے خوف رقصاں ہیں نئے پیماں کے پہلو میں

سفر میں ہم تو نکلے تھے رہِ عرفاں کی جانب، پر
بھٹک کر رہ گئے اب کفر اور ایماں کے پہلو میں

وہ جس کو ڈھونڈنے نکلے تھے ہم ہفت آسمانوں میں
وہی تو آن بیٹھا ہے دلِ ویراں کے پہلو میں

کبھی فرصت ملے تو خود سے مل کر دیکھنا صاحب
بڑی رونق لگی رہتی ہے اس زنداں کے پہلو میں

تمھارے شہر کے دیوار و در سب اجنبی سے ہیں
بس اک سودا سا رہتا ہے مرے امکاں کے پہلو میں

قلم سے آگ لکھتا ہے تو پھر، یہ دھیان رکھ زین اب
کوئی بستی نہ جل جائے ترے دیواں کے پہلو میں

عبدالرؤف زین

اقبال کا تصورِ آہ فغاں

کسی بھی زبان کی ادبی روایت کے تہذیبی پس منظر سے آشنائی کے بغیر بہت سے معنیاتی زاویے دسترس سے باہر رہ جاتے ہیں اور متن کی درست تفہیم ممکن نہیں رہتی۔ اقبال کے ایک بہت معروف شعر:

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

.....

کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ میں نے اس شعر بارے چند معروف شارحینِ اقبال کی شرحوں پر نگاہ ڈالی تو ملول و پریشان ہو کر رہ گیا۔ ان میں سے بیشتر نے اس شعر کی تشریح میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اقبال کہتا ہے کہ؛ غم نہ کر، ابھی تو صرف ایک نشیمن ہاتھ سے گیا ہے۔ آگے چل کر تو رنج والم کے کئی اور مرحلے بھی آنے والے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ کوئی شارح اگر اقبال کے تصورِ آہ و فغاں سے پوری شناسائی نہ بھی رکھتا ہو تو اسے درست تفہیم تک پہنچنے کے لیے اس شعر کے یہ الفاظ (تو کیا غم) ہی کافی ہونے چاہئیں۔ ہم کسی دکھی انسان کو غم نہ کرنے کا کہتے ہیں تو گویا اسے حالات میں بہتری آنے کی امید افزا تسلی دیتے ہیں۔ کہ بھائی اس میں غمگین ہونے کی کیا ضرورت ہے حالات لازماً بہتر ہو جائیں گے۔ اگر کہنے والے نے ابھی مزید برے حالات کی خبر دینی ہو تو وہ ''غم نہ کر'' کے بجائے یہ کہے گا کہ ''حوصلہ رکھیں ابھی تو اور بھی سختیاں آئیں گی۔'' مگر شعر کے تیور تو صاف بتا رہے ہیں کہ شاعر کسی ایک راستے کے بند ہو جانے پر خود کو اور دوسروں کو بھی تسلی دیتے ہوئے یہ کہہ رہا ہے کہ اگر مجھ سے یا ہم سے ایک مقامِ آہ و فغاں چھن گیا ہے تو کوئی غم نہیں آہ و فغاں کا عمل جاری رکھنے کے کئی اور مقامات بھی موجود ہیں۔۔ یہ تو واضح ہو گیا کہ اس میں

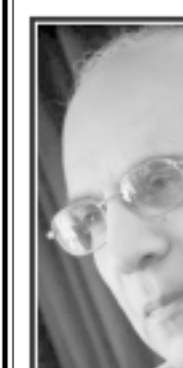

جلیل عالی

اپنایا یا مخاطب کا حوصلہ بڑھایا گیا ہے اور خوش کن امکانات کی نوید سنائی گئی ہے۔ لیکن جب تک آہ وفغاں کے حوالے سے اقبال کا رجائی مفہوم نہیں سمجھا جائے گا، شعر کی صحیح تفہیم نہیں ہوگی۔

اقبال کے تصورِ آہ وفغاں پر قلم اٹھانے کے پیچھے دو واقعات کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ پہلا یہ کہ ایک محدود محفل میں جب ڈاکٹر انور محمود خالد نے اردو کے ایک بڑے اسکالر مشفق خواجہ (مرحوم) کے سامنے اس تحریر کے آغاز میں درج ہوئے شعر بارے ذرا استہزائی انداز سے میری تعبیر کا ذکر کیا اور میں نے مختصر الفاظ میں اپنے تفہیمی زاویے کی وضاحت کی تو مشفق خواجہ (مرحوم) جیسے ثقہ روایت شناس نقاد و محقق نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ''عالی صاحب آپ ذرا دور کی کوڑی لانے والا کام نہیں کر رہے!'' ان کے اس جملے سے مجھ پر کھلا کہ تفہیم کی معذوری بعض اوقات بڑے بڑے علمی ایوانوں میں بھی نقب لگا جاتی ہے۔ اس واقعے کے چند برسوں بعد اس کے بالکل برعکس ایک اور واقعے نے مجھے یہ بھی سمجھا دیا کہ جب قدرت مہربان ہو تو وہ سچی دھن رکھنے والوں کی کیسے خود رہنمائی کرتی ہے۔ ہوا یہ کہ لاہور کے ملٹری ہسپتال میں تعینات میرے سرجن بیٹے میزان جلیل نے اپنے ایک ہم عمر رفیقِ کار ڈاکٹر واصف ادریس سے ملوایا اور بتایا کہ اسے اقبال کی شاعری سے بہت دلچسپی ہے۔ میں نے امتحان لینے کے خیال سے نوجوان ڈاکٹر کے سامنے اقبال کا یہی شعر پڑھا اور پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تو اس نے واضح الفاظ میں وہی مفہوم بتا کر جو اقبال کا مقصود تھا مجھے ششدر کر دیا۔

اس شعر بارے تفہیم کی یہ الجھن دراصل آہ و فغاں کے الفاظ کو ان کے لغوی معنی تک محدود رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ شاعری میں تو درمیانے درجے کے شعرا کے ہاں بھی الفاظ سطحِ لغت سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ اقبال تو ایک خلاق نظریاتی شاعر ہے اس کے ہاں تو بیشتر الفاظ اپنی معنیاتی پرتوں کے اعتبار سے اس کے مخصوص تصورات سے جڑے ہوئے ہیں۔ اقبال کے دیگر تصورات کی طرح 'آہ وفغاں'، 'نالہ وفریاد' اور 'درد و سوز' کے الفاظ بھی ایک خاص تصور رکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک کسی بڑے نصب العین سے وابستہ افراد انسانیت کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ اعلا مقاصد کی تڑپ ہی ان کی اصل دولت ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی انسان کے احساسِ جمال و

خیر کو جس طرح کے پیکر کی دید بے تاب رکھتی ہے۔ جیسی دنیا کی تمنا اس کے لیے ایک خاص اضطراب کا سبب بنتی ہے اور جیسا نظریہ یا نصب العین اس کے پورے وجود کو تحریک دیتا ہے؛ ''آہ و فغاں'' کے الفاظ ان سب حوالوں سے انسانی ذات کی سچی اور بامعنی تڑپ کا استعارہ ہیں۔ ''آہ و فغاں'' محبوب یا آدرش بارے عاشقانہ ذوق و شوق، اس کے فراق کے کرب و اضطراب اور اس کے حصول کی راہ میں پیش آنے والی سختیوں کے ناطے ہر طرح کے ردِعمل کو محیط ہے۔ چنانچہ اقبال کے ہاں 'نالہ و فریاد'، 'درد و سوز' اور 'آہ سحر گاہی' جیسے تمام الفاظ اسی بنیادی جوہرِ حیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

بہت ابتدائی کلام پر مشتمل کتاب ''بانگِ درا'' میں شامل اس کی مشہور نظم ''ایک آرزو'' کے دو شعر دیکھیے کہ کس وضاحت سے نالے کے حیات افزا مفہوم کو اجاگر کر رہے ہیں۔

پھولوں کو کوئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو ، نالہ مری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

.....

بعد کی شاعری میں تو یہ سب الفاظ اور بھی گہرے اور زرخیز معانی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

.....

مجھ میں فریاد جو پنہاں ہے سناؤں کس کو
تپشِ شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو

.....

آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوزِ جوہرِ گفتار سے

.....

جہانِ صوت و صدا میں سما نہیں سکتی
لطیفۂ ازلی ہے فغانِ چنگ و رباب

.....

دیا اقبالِ ہندی نے مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

.....

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

.....

خود اقبال کے لیے اس کی عظیم اور قابلِ فخر شعری واردات، اس کے برتر نصب العین ہی کی نمائندہ ہے۔ اور وہ اپنی اس عزیز ترین اور انتہائی قیمتی متاع کو فغاں کا نام دیتا ہے۔

اڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

.....

یعنی میں جس انداز میں فغاں کرتا ہوں، جس رنگ اپنی اندرونی وجودی تڑپ کا اظہار کرتا ہوں، جس ڈھب سے اپنے احساسِ جمال و خیر کے لیے کلپتا ہوں اور جس اسلوب سے اس بے قراری کو شعر میں ڈھالتا ہوں؛ دوسرے شعرا اس کی نقل کرتے ہیں - شاعری اور اپنا اپنا مثالیہ (نظریۂ حیات) انسان کے وجودی جوہر کا بہترین اظہار ہوتا ہے- دیکھیے فیض احمد فیض بھی ایک نظریاتی شاعر ہیں- اپنی نظریاتی وابستگی کی پاداش میں انھیں جیل بھی جانا پڑا -اور انھوں نے اپنے نظریے (اپنے عشق، اپنے مثالیے یا اپنے نصب العین) کی خاطر خوشی خوشی جیل کی صعوبتیں برداشت کیں اور اس حوالے سے جو شاعری کی اس کے بارے میں اقبال ہی کے انداز اور الفاظ میں یہ کہا کہ:

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

.....

یعنی ہم نے قید خانے میں اپنے نصب العین کے حوالے سے جس انداز میں شاعری کی ہے دیگر شاعر بھی اس طرزِ اظہار کی پیروی کرنے لگے ہیں- گویا فیض نے بھی اقبال کی طرح 'فغاں' کو اپنے محبوب نظریے اور نصب العین کا استعارہ بنالیا-

یوں تو قدرت نے ہر صاحبِ فن کو کسی نہ کسی انفراد سے نواز رکھا ہوتا ہے- یہ انفراد ملتے جلتے خیالات کے باوجود اپروچ اور طرزِ اظہار دونوں میں اپنی جھلک دکھاتا ہے- اقبال کا ایک مشہور شعر اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے-

پسند اس کو تکرار کی خُو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

.....

اسی بات کو احسان دانش نے اپنے انداز سے یوں بیان کیا ہے:

جتنے اربابِ جنوں اتنے ہی اندازِ فغاں
ایک سے ایک کی ملتی نہیں آواز کبھی

.....

اقبال ایک تحریکی شاعر ہے- وہ اپنے نصب العینی پیغام کے عام ہونے کے لیے خدا سے یوں دعا کرتا ہے:

دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

.....

جیسے غالب خود کو اپنے اس شہرِ خواب (آئیڈیل معاشرے) جو ابھی ناموجود

ہے کا شاعر قرار دینے کے لیے بلبل اور گلشنِ ناآفریدہ کے استعاروں میں بات کرتا ہے۔

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں
(میں ایک ایسے گلشن کا بلبل ہوں جو ابھی عالمِ شہود میں نہیں آیا اور میں ابھی سے اس کے تصور میں گیت گا رہا ہوں)

اقبال خدا سے دعا کرتا ہے کہ اے خدا میں ایک اجڑے ہوئے باغ کا بلبل ہونے کی حیثیت سے جو نالہ و فریاد کر رہا ہوں اس میں غیر معمولی تاثیر پیدا کر دے۔

مَیں بُلبلِ نالاں ہوں اِک اُجڑے گُلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا، دے!

ایک جگہ اقبال خود کو یہ تلقین کر رہا ہے کہ اے اقبال تیرا شعری پیغام ابھی پوری طرح پختہ نہیں ہوا تو اسے خام شکل میں لوگوں کے سامنے نہ لا، جلد بازی نہ کر۔ ضبط سے کام لے۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

.....

دیکھیں اس میں بھی وہ اپنی آدرشی پیغام بھری شاعری کو نالے سے تعبیر کر رہا ہے۔ اقبال کے لیے اس کی فغاں ہی اس کا جوہرِ حیات اور سرمایۂ افتخار ہے۔ وہ اپنی غیر معمولی شعری واردات کی شان و عظمت پر خود خالقِ کائنات کو حیران ہوتے دکھاتا ہے۔

اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی

.....

وہ اس فغاں کو کبھی ''نوائے شوق'' کہتا ہے اور اس کی توانائیوں سے عالمِ بالا کو بھی حیران و پریشاں کر دینے پر تفاخر کا اظہار کرتا ہے۔

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدہ صفات میں

وہ تو اپنی فغاں سے ایسے کرشمے دکھانے کا قائل ہے کہ جو روایت میں رہتے ہوئے روایت کو نئے انقلابی تحرک سے ثروت مند کر دے۔

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقش بند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

.....

وہ تو انسان کو اسی بنیاد پر اشرف المخلوقات مانتا ہے اور تخلیقِ کائنات کا مقصد ہی یہی قرار دیتا ہے کہ انسان دنیوی استراحتوں کا پیچھا کرتے رہنے کے بجائے ہمہ وقت اعلا مقاصد کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل رہے:

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

.....

یعنی یہ دنیا بنائی ہی اس لیے گئی ہے کہ انسان

یہاں کسی بڑے نصب العین کی تڑپ (عشق) میں سخت کوش زندگی گزارے نہ اس لیے کہ بے مصرف نشاط وسکون کا عادی ہو رہے۔ جیسے میر درد بھی اپنے ایک نمائندہ اور کلیدی شعر میں زندگی کا اصل مقصد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

.....

اقبال تو اس سے بھی کہیں آگے جا کر خود کائنات میں ظہور پذیر ہونے والے نت نئے واقعات کے ناطے وقت کے بہاؤ کو بھی ساز ازل کی فغاں یعنی قدرت یا مشیت کے عظیم مقصد کی تکمیل کی پُر جوش اور بے تابانہ سرگرمی قرار دیتا ہے۔

سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات

.....

اقبال نے تو اپنے ایک شعر میں انسان کے احساسِ جمال کے نمائندہ آدرش سے اس کی والہانہ و عاشقانہ وابستگی کو عبادت کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ شعر دیکھیے:

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

.....

یعنی اپنے اپنے میدان کی ان چاروں عظیم ہستیوں نے اپنے تخلیقی فکری جوہر کو جس کمال پر پہنچایا اس کے پیچھے ان کی محنتِ شاقہ کے ساتھ راتوں کے پچھلے پہر خالق ازلی کے سامنے گڑگڑانے اور اس سے استعانت طلب کرنے کے عمل کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

صوفیا تو اس دنیا کی زندگی کو اپنے محبوب (حسنِ مطلق یعنی خدا) سے جدائی کا زمانہ محسوس کرتے ہیں۔ اور اس کی فرقت میں تڑپتے ہیں اور صوفیا کی موت کے دن شبِ عروسی کی مناسبت سے عرس منایا جاتا ہے کہ مر کر انہیں اپنے محبوب یعنی خدا سے ملاقات کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ گویا سچے صوفی کی پوری زندگی اللہ کی محبت میں تڑپنے سے عبارت ہے۔

اقبال کے مرشد مولانا روم درد و سوز سے خالی زندگی کو بے کار جانتے ہیں۔ اقبال نے خود ان کا یہ شعر ایک جگہ درج کیا ہے۔

اے خدا روزے کن آں روزے مرا
وا رہاں زیں روز بے سوزے مرا

(اے خدا! میرے لیے وہ (وصال کا) دن لے آ۔ مجھے اس بے سوز (بے کیفیت اور بے درد) زندگی سے نجات دلا دے۔)

اللہ تعالیٰ کی قربت کی تڑپ خود لہو و لعب سے پاک بھلائی کے راستے کی علامت ہے۔

اسی حوالے سے اقبال کے فارسی کلام میں بھی کئی مقامات پر آہ وفغاں کے جوہر سے ثروت منداشعار ملتے ہیں۔

عشق تا طرحِ فغاں در سینہ ریخت
آتشِ او از دلم آئینہ ریخت
(رموزِ بےخودی)

(عشق نے سینے میں فغاں کی بنیاد رکھی تو اس کی آگ نے میرے دل کو آئینہ بنادیا)

مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ
سوی یثرب سفر بے کارواں بہ
کجا مکتب ، کجا میخانۂ شوق
تو خود فرما مرا ایں بہ کہ آں بہ
(ارمغان حجاز)

(مجھے تنہائی اور آہ وفغاں ہی راس آتی ہے۔ مجھے مدینہ طیبہ کی جانب بغیر کارواں کے سفر کرنا پسند ہے۔ کہاں مکتب اور کہاں عشق کا میخانہ۔اپ ہی فرمائیں میرے لیے یہ بہتر ہے یا وہ)

غم راہی نشاط آمیزتر کن
فغانش را جنون انگیزتر کن
بگیر ای ساربان راہ درازی
مرا سوز جدائی تیزتر کن
(ارمغان حجاز)

(اے ساربان تو مسافر کے غم (عشق) کو اور زیادہ نشاط آمیز بنا،اس کی آہ وفغاں کو اور زیادہ جنوں انگیز کر دیکوئی لمبا راستہ اختیار کر اور یوں میرے جدائی کے سوز کو اور تیز کر)

سخن دردو غم آرد، دردو غم بہ
مرا این نالہ ہائے دمبدم بہ

سکندر را در عیشِ من خبر نیست
نوائے دلکشے از ملکِ جم بہ
(شاعری دردوغم لاتی ہے مگر یہ دردوغم خوب ہے۔ مجھے ہر وقت کا نالہ وفریاد اچھا لگتا ہے۔ سکندر میرے عیش کو کیا جانے۔ دل کش نوا جمشید کی شاہی سے بہتر ہے۔)

اقبال انسان کو معمول کی زندگی سے اوپر اٹھ کر اپنے اندر کے ہر جوہر کو باہر لانے ،اپنے ان خوابوں اور اپنے ان آدرشوں کے اظہار کی ترغیب دیتا ہے جو اس کو ہانٹ کرتے اور بےقرار رکھتے ہیں۔

بر آور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے ، نالہ آہے ، فغانے
(نغمہ ہو، آہ و نالہ ہو یا فغاں؛ جو کچھ بھی ترے سینے میں ہے اسے باہر نکال)

آخر پر ''زبورِ عجم'' سے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں جو اقبال کے ہاں نالہ اور آہ وفغاں کی معنیاتی گیرائی و گہرائی کی طرف انتہائی بلیغ اشارے کرتے ہیں۔

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کارے است کہ بے آہ وفغاں نیز کنند
(زبورِ عجم)

(میں نے آہ و نالہ سے اس لیے کام لیا کہ تو بیدار ہو جائے۔ ورنہ عشق ایسا کام ہے جو آپ و فغاں کے بغیر بھی سرانجام پا سکتا ہے۔)

طرحِ نو می افگند اندر ضمیرِ کائنات
نالہ ہا کش سینۂ اہلِ نیاز آید بروں
(اہلِ نیاز کے سینوں سے جو نالے اٹھتے ہیں وہ ضمیرِ کائنات میں نئے دور کی بنیاد رکھتے ہیں۔)

از نالۂ مرغِ چمن ،از بانگِ ازاں خیز
از گرمیِ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
ازخواب گراں،خواب گراں،خواب گراں خیز
ازخوابِ گراں خیز

(طائرِ چمن کے نالے سے اٹھ، بانگِ اذاں سے اٹھ اس گہری نیند سے، گہری نیند سے، گہری نیند سے بیدار ہو۔ گہری نیند سے بیدار ہو)

زدستِ ساقیِ خاور دو جامِ ارغواں درکش
کہ از خاکِ تو خیزد نالۂ مستانہ پے در پے
(اب ساقیِ خاور (اقبال) کے ہاتھ سے بھی ایک دو لالہ گوں جام ہی لے تا کہ تیری خاک سے ہے در پے مستانہ نالے بلند ہوں)

بہ نگاہ آشنائے چوں دروں لالہ دیدم
ہمہ ذوق و شوق دیدم، ہمہ آہ و نالہ دیدم
(جب میں نے آشنا نگاہ کے ساتھ لالے کے اندر دیکھا تو اسے تمام تر ذوق وشوق اور آہ و نالہ پایا۔)

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ میں نالہ حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں
(زندگی ہزاروں برس کعبہ و بت خانہ میں فریاد کرتی ہے تب جا کے کہیں بزمِ عشق میں ایک دانائے راز ظاہر ہوتا ہے۔)

اے کہ زمن فزودۂ گرمیِ آہ و نالہ را
زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را
(اے وہ ذات جس نے میرے ذریعے آہ و نالہ کی گرمی بڑھا دی ہے۔ میری صدا سے خاک کے ہزار سالہ ڈھیر میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دے۔)

فاختۂ کہن صفیر نالہ من شنید و گفت
کس نہ سرود در چمن نغمۂ پار این چنیں
(پرانے گیت گرنے والی ایک فاختہ نے میرا نالہ سنا تو کہا کسی اور نے چمن میں کبھی ایسا نغمہ نہیں گایا۔)

ازاں معنی کہ چوں شبنم بجان من فروریزی
جہانے تازہ پیدا کردہ ام عرضِ فغانے را
(وہ معانی جو تو نے شبنم کی طرح میری جان پر اتارے ہیں، ان کے فیض سے میری عرضِ فغاں نے نیا جہان پیدا کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر عبید بازغ امر کی ''محبت نام ہے میرا'' پر ایک محبتانہ نظر

نسیم سحر

کئی عشروں سے ڈاکٹر عبید بازغ امر سے شناسائی ہی نہیں، ادبی دوستی بھی ہے کہ ان کے پاس ایک جدا طرز کا تخلیقی اور تنقیدی نظریہ بھی ہے۔ طول طویل نشستوں میں بھی ان سے ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا ہے۔ ایک تعلیمی سلسلے میں ان کے ساتھ پشاور جانے کا بھی کئی مرتبہ اتفاق ہوا اور میں نے انہیں کبھی تازہ ادبی منظرنامے سے دُور نہیں دیکھا۔ تعلیمی سلسلے کا ذکر یوں ضروری ٹھہرا کہ اسی سلسلے میں روز و شب کی محنت نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب کیا اور اب وہ ڈاکٹر عبید بازغ امر ہیں!

جب اُن کی کتاب ''محبت ہے میرا نام'' موصول ہوئی تو مَیں اس کے عنوان سے سمجھا کہ یہ ان کی ٹین ایج کی رومانی شاعری ہوگی جس میں مشہور فلم ''میرا نام ہے محبت'' کے کئی شعری سین بھی ہوں گے۔ مگر ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ''!

جب اطمینان سے کتاب کا مطالعہ کیا تو لگا کہ ''ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ''۔ ڈاکٹر عبید بازغ امر مجھے ایک

جدید ترین نظریہ اور احساس رکھنے والے حساس ادیب اور شاعر دکھائی دیئے، ان کی ترقی پسندی اور جدید علامتی اظہار تو بہت پہلے سے ان کے شعروں میں جھلک اور چھلک رہا تھا، مگر اب ان کے شعروں میں محبت کے بجائے مزاحمت اور احتجاج کا رویّہ بھی نمایاں محسوس ہوا، کہیں کہیں کومل، دھیمے سُروں میں، جس کے تحت ان کی نظمیں فیض احمد فیضؔ کی یادیں تازہ کرتی ہیں، اور کہیں بلند بانگ یا ''لاؤڈ'' لہجے میں جس سے حبیب جالب کی یاد آجاتی ہے۔ تاہم ان کی شاعری میں فیضؔ اور جالبؔ نہیں، بل کہ ڈاکٹر عبید بازغ امرھی اپنے اسلوبی کمال اور لفظی دسترس کے ساتھ بول رہے ہیں، ان کی اپنی سوچیں، اپنا نقطۂ نظر، اپنا نظریہ ان نظموں میں اپنے انفراد کے ساتھ نہ صرف فیضؔ اور جالبؔ سے بل کہ اپنے ہم عصر نظم گو شعرا سے بھی ایک جدا گانہ اسلوب اور اظہار رکھتا ہے۔

کتاب میں عہدِ موجود کے چار نظم گو شعرا (ڈاکٹر روش ندیم، منیر صادق، ڈاکٹر خلیق الرحمان اور ڈاکٹر حنیف اللہ صاحبان) نے ان کی نظم گوئی کے محاسن، موضوعات اور اسلوب کا جس تفصیل سے احاطہ کیا ہے اُن کے سامنے راقم السطور کا کہنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مصداق ہوگا کہ غزل کے مقابلے میں اس کا نظم گوئی سے تعلق بس آٹے میں نمک کے برابر ہی ہے۔ یا اتنا سمجھ لیں جتنا ڈاکٹر عبید بازغ کو غزل گوئی سے ہے۔ تاہم نظم گوئی سے عمومی محرومی کے باوجود میں اچھی نظمیں پڑھنے کے لیے بے چین رہتا ہوں، چنانچہ ''محبت نام ہے میرا'' پڑھ کر نظم سے میری محبت مزید مستحکم ہوگئی ہے۔

صنف نظم نے ابتدائی مراحل کے کلاسیکی انداز اور موضوعاتی و ہیئتی تحدید کے بعد سے بڑا طویل سفر طے کیا ہے اور مختلف مراحل میں اپنا ارتقائی سفر جاری رکھا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا دور بھی اپنے ساتھ نئے موضوعات اور مسائل لایا، انسان نے سائنسی ایجادات کی ترقی کو ہیروشیما اور ناگاساکی کے روپ میں انسانی مستقبل کے لیے خطرہ محسوس کیا۔ مگر اب جدید منظر نامے میں یہ خطرہ بہت معمولی محسوس ہوتا ہے کہ اب مصنوعی ذہانت اور ڈرون ٹیکنالوجی نے جو شدت کے خطرات پیدا کر دیئے ہیں ان کے سامنے پرانے خطرات کچھ بھی نہیں۔ سائنسی خطرات کے ساتھ آئی ایم ایف کے معاشی استحصال اور پابندیوں نے بھی خاص طور پر تیسری دنیا کو

جکڑ رکھا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا جدید ترین مظہر مصنوعی ذہانت کے استعمال کی صورت میں نوعِ انسانی کے لیے لمحۂ فکریہ بنی ہوئی ہے۔ ماضی قریب میں اسرائیل نے غزہ پر جو ڈرون حملے کیے ان کا یقینی ٹارگٹ مصنوعی ذہانت نے طے کیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کی مئی ۲۰۲۵ء کی چند روزہ جنگ میں بھی یہی مصنوعی ذہانت عمل میں لائی گئی۔ یہ سب ادوار اور انقلابی نوعیت کی تبدیلیاں کسی حساس اور باشعور ادیب کی تخلیقات میں ظاہر نہ ہوں تو یوں جانیے کہ اس کا ادب آؤٹ ڈیٹڈ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر عبید بازغ امر کی نظمیں پڑھ کر ان کے آؤٹ ڈیٹڈ ہونے کا نہیں بل کہ اَپ ڈیٹڈ ہونے کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اِن تازہ ترین موضوعات کو بھی اور عالمی مفاداتی سیاست کے منظر نامے کو بھی موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ ان کی نظموں میں بے معنویت، لایعنیت، اور تجریدیت کے ناکام تجربے کہیں نہیں ملتے اور وہ اپنے ساتھ قاری کو بھی الجھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اپنے قابلِ رشک خاندانی ادبی پس منظر کے ساتھ وہ الفاظ اور اسلوبِ اظہار کا سلیقہ بخوبی جانتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر خلیق الرحمان ''ترقی پسندانہ شعری روش اور نظریاتی فکر ان کے فن کا ایک لازمی جزو بن چکے ہیں''۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ترقی پسندی اور روشن خیالی سے آراستہ نظم گو شاعر ہیں، اور ان کی شاعری گزرتے ہوئے زمانے سے ایک والہانہ سحر آگیں مکالمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ خوگرِ حمد ہو کر بھی اپنی نظم ''اے سخی'' میں خالقِ کائنات سے یوں گلہ کرتے ہیں:

اے سخی / میں تیرا شکر کیسے ادا کروں / کہ تو اپنے خزانے / سارے جہاں میں بانٹتا ہے / اور ''خالی پن'' کی دولت سے / میرا کشکول بھرتا ہے

.....

وہ اپنے لفظوں کے جادو سے منظر کو زندہ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''ارتعاش'' کے کچھ مصرعے ملاحظہ ہوں جن میں ارتعاش کا لفظ زندہ اور مجسم ہو کر سامنے آجاتا ہے:

کہیں تیز ہوئی ہوئی بارشوں میں / چمکتی ہوئی اک کرن پھوٹتی ہے / زمستاں میں ٹھٹھرے ہوئے برف پاروں میں / پگھلاہٹوں کا عمل جاگتا ہے / کسی چاند چہرے کی اجلی جھلک سے / فضاؤں کا تیرہ فسوں ٹوٹتا ہے / کسی کھلکھلاتی ہوئی اک صدا سے / سکوتِ غم

زندگی پھوٹتا ہے۔

ان کے ہاں لفظی تراکیب کا حسن نظموں کی جمالیاتی اور فنی کمال کو عمدہ انداز میں اجاگر کرتا ہے، چند ایسی طویل و مختصر تراکیب ملاحظہ ہوں :

زبانِ کلک و صریرِ خامہ، رہینِ گردِ رہِ فنا، وجودِ مبہم، پاسِ ناموسِ حرف، نشاط ریز، یادِ مطلعِ خیال،

دفاترِ شمارِ ماہ و سال و یوم و ہفت، بزمِ عیش کوش، قتیلِ خنجرِ خرد، وقفِ انجماد، ماورائے منتِ الفاظ، دامِ سیم و زر ان کے انقلابی تصورات کی عکاسی کرتی ہوئی ایک نظم ''یقین جانو'' کی یہ لائنیں ان کے نظریے کا بیان واشگاف الفاظ میں یوں کرتی ہیں؛

لرز اٹھیں گے / شکوہ رفتہ کے قصر سارے / محل منارے

/ جنوں میں ہوگی وہ سنگ باری / پناہ مانگیں بے نواؤں سے تختِ طاؤس کے پجاری / یقین جانو کہ تاجِ شاہ / غریبِ شہرِ ستم کے قدموں میں جا گرے گا۔

.....

ان کی کچھ نظمیں لاؤڈ انداز کی ہیں، ایک نظم ''بیداری'' کی یہ چند لائنیں دیکھیے جو اُن کے مجموعی تخلیقی اور جمالیاتی انداز کو کسی حد تک متاثر کرتی ہیں اور نعرہ بازی کا احساس دلاتی ہیں:

میں تیرے پروپیگنڈے میں نہیں آؤں گا / تیرے حق میں ووٹ کاسٹ نہیں کروں گا / تو جاگیردار کا سہولت کار / اور سرمایہ دار کا طرفدار ہے / تو فاشسٹ ہے،

.....

لیکن ایسی لاؤڈ نظموں کے مقابلے میں ان کی مکمل طور پر جمالیاتی و فکری انداز کی حامل نظمیں ہی اصل میں ان کی تخلیقی زرخیزی کی نمائندگی کرتی ہیں اور کسی وقتی جذباتی کیفیت کے تحت لکھی گئی نظمیں بس دل کی بھڑاس نکالنے کا ذریعہ ہی جانیے۔ نظم گوئی کی کائنات میں اُن کا حقیقی مقام ایک مستقل فکری عمل اور تخلیقی وفور کے تحت لکھی جانے والی نظمیں ہی متعین کریں گی۔ ظاہر ہے ابھی انہیں اسی انداز میں ابھی اَور بہت کچھ لکھنا اور ادبی منظرنامے کو شاداب کرنا ہے۔ اور یہ اظہاریہ تمام کرتے ہوئے یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ ہم جیسے ان کے چاہنے والوں کو بھی ان کے کمالِ ہنر پر ابھی اور بھی بہت کچھ لکھنا ہے۔

وما علینا الا البلاغ۔

☆☆☆☆☆

تسنیم حسن کی تخلیقی پرواز

حالِ دل ہی نہیں کہا تم سے
سب مضامین گفتگو میں رہے

اب گریباں ہے چاک نہ دامن
سب جنوں خواہشِ رفو میں رہے

....

یہ جو سب مضامین کا گفتگو میں رہنے کی خلش کا اظہار ہے یہی تو ہماری مشرقی اقدار کی دین ہے، ہماری تہذیب کا اثاثہ ہے، جسے نسائی کیفیات کی فطری دل بستگی کے ساتھ شاعرہ نے اپنے فکر و خیال کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ اس میں کسی بھی نام نہاد شاعرانہ جدت طرازی کی بے روح چال سازی نہیں ہے، وجودی ہوس ناکی نہیں کے۔ رومان انگیز جذبات و احساسات، کی ایک سنبھلی ہوئی آرزومندی ہے جو ذات کی نارسائی کے پہلو بہ پہلو اظہار کی وارفتگی نمایاں کرتی ہے۔

نہ گریباں چاک نہ دامن تار تار

....

یہاں تک کہ جنوں کی حشر سامانیوں کو بھی خواہشِ رفو میں رکھا۔ ورنہ تو اردو کلاسیکی شعری روایات میں جادۂ عشق اختیار کرنے والوں کو یہاں تک کہنا پڑا:

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

....

شعور کی آنکھ سے زندگی اور اُس کے مظاہر کا نظارہ کرنے والی ہماری اس لائق تحسین شاعرہ کے ہاں لفظ پر توجہ دینے اور اس کے سیاق و سباق کے وجدانی ادراک کا احساس بھی جہاں جہاں نمایاں ہُوا ہے، خوب ہُوا

نثار ترابی

ہے۔ لفظ کا حقیقی در و بست کیا ہونا چاہیے اور اِس کی معنویت کی ممکنہ سمتیں کہاں کہاں اپنا طلسماتی جہاں آباد کیے ہوئے ہیں، اس کا شعور یوں تو ان کے ہاں متعدد مقامات پر اُجاگر ہوا ہے، تاہم سرِ دست ان دو شعروں میں سماعت کیجیے:

میرے دکھ کا مسیحا حنا کار تُو
میرے زخموں کو رنگِ حنا چاہیے

تسنیم نے سمجھا ہے مسیحائے محبت
وہ شخص جو زخموں کا حنا کار لگے ہے

.....

علامتی ماحول میں رہتے ہوئے، دیسی اقدار سے رشتہ رکھنے والی ہماری آج کی مہمان شاعرہ نے ادبی زندگی کی جملہ یافت صداقتوں کے محور کا سارا اضطراب اپنی شاعری میں سمٹ رکھا ہے۔ اِسی سبب سے اپنے اس اولین مجموعے میں ''یافت'' کے زیرِ عنوان، لکھتے ہوئے اپنی شاعرانہ جستجو کو شعوری آنکھ کا درجہ قرار دیا ہے۔

شعور اور شعر، لازم و ملزوم ہیں۔ حقیقی شاعری میں شعور کے ادراک کے در وا نہ ہوں تو شاعری، شاعری نہیں رہتی۔ سوشل میڈیا میں گردش کرنے والی ''فیس بک کی علامت بن جاتی ہے۔ عمومی طور پر یہ بلاضرورت اور بے محابہ ''لائیکس'' تو بہت مل جاتی ہیں لائق ادب قارئین کم ہی میسر آتا ہے۔

تسنیم صاحبہ اور ان کے دیگر ادبی احباب خصوصاً اشتیاق میر صاحب اور محترمہ غزل انصاری کے ساتھ، یارک شائر ادبی فورم کے تحت ہونے والی شعری نشستوں میں ان سے ایک دو نہیں، اس سے بھی زائد ادبی ملاقاتوں کی خوشی میرے درجنوں کے برطانیہ کے ادبی دوروں کا حاصل بنی۔ میں نے انھیں ہر بار ایک نہایت شائستہ خو، بُردبار مہمان نواز ادب دوست شخصیت کے طور پر محسوس کیا۔ سخی برتاؤ کے یہی تابندہ نقوش ان کے آئینۂ شاعری کا زیور ہیں۔

جب محبوبِ جاں کے سامنے لاج کے مارے اُسے اپنی چادر سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے تو اُسے کہنا پڑتا ہے:

شاعری، اداکاری شعری گوئی فنکاری
محفلِ سخن اب تو تالیوں کا میلہ ہے

.....

مئی 1998 سے کرونا کی وبا سے قبل تک کا سارا عرصہ جب میری یادداشت کی لوح پر جگمگاتا ہے تو اس سے اصل ہو جانے والی روشنی مجھے بتاتی ہے کہ تسنیم حسن کا شمار برطانیہ میں مقیم نئی نسل کی ممتاز شاعرات یاسمین حبیب، نجمہ عثمان، شبانہ یوسف، اور

گلناز کوثر کی طرح تسنیم حسن کا شعری معاملہ بھی جز وقتی ہنگامہ خیز اور عمومی سطحی فضا و ماحول سے الگ ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو اُس کے ایوانِ شعر سے یہ شعری گواہی کبھی اپنا اعلان نہ کرتی شاعری، اداکاری، شعر گوئی، فنکاری، محفلِ سخن اب تو تالیوں کا میلہ ہے۔ ذوقی سطح پر اس نوع کے عصری شعری میلانات کے بے لطف اور بے روح منظروں کا خیال ذہن میں لاتے ہوئے جناب افتخار عارف نے کبھی کہا تھا:

کھیل تماشا، بربادی پر ختم ہوا
ہنسی اڑا کر بازی گر خاموش ہوا

....

شاعرہ کے ہاں نسائی جذبات واحساسات کی ترجمانی اپنی فطری سائیگی سے ہم آہنگ ہو کر فکر وخیال کے نقش ابھارتی ہے۔ دلوں میں جگہ بناتی ہے اور کہیں کہیں تو باقاعدہ روح سے مکالمہ کرنے کی سرشاری بھی عطا کرتی ہے۔ شعری تخلیق کے اس اولین مرحلے پر اگر ہمیں شاعرہ کے ہاں اظہار کی ایسی قابلِ تحسین خوبی میسر آجاتی ہے تو یہ کوئی کم اہمیت کی بات نہیں ہے۔

"یافت" کے مطالعہ سے ہمارا تعارف ایک ایسی ابھرتی ہوئی شعری آواز سے ہوتا ہے جو یقیناً اپنے امکانی مقامِ شاعری کو پانے کی سچی جستجو کی ہم احساس ہے۔ خدا کرے کہ جہانِ ادب میں اُسے اُس کے زندہ خوابوں کی تعبیر ملے زیرِ نظر شعری مجموعے سے چند ایسے اشعار جو دامنِ توجہ کو بار بار اپنی طرف کھینچتے ہیں اور قاری کو مجبور کرتے ہیں کہ اُنھیں یاد رکھا جائے:

میں اپنی گونج میں ہی کھو گئی ہوں
مجھے اپنی صدا کا سامنا ہے

....

دل کی آواز کناروں سے پلٹ آتی ہے
ایسا لگتا ہے کہ اُس پار نہیں ہے کوئی

....

اِس دل کی دھڑکنوں میں رہا اور کچھ نہیں
ہے میرے ٹوٹنے کی صدا اور کچھ نہیں

صدق و وفا خلوص و محبت، عنایتیں
دُکھتے ہوئے دلوں کی دوا اور کچھ نہیں

....

یہ دل چراغ ہے ایسا رہِ محبت کا
جو بجھ بھی جائے تو جلتا دکھائی دیتا ہے

....

میں اپنی سانس میں بھرتی ہوں سب مہک اُس کی
کہیں جو پھول سا چہرہ دکھائی دیتا ہے

....

اور اب آخر میں شاعرانہ عجزِ بیان کا حامل وہ شعر جس میں خوئے فقیری کا عجب اِک بانکپن اُتر آیا ہے:

مرا اپنا اثاثہ کچھ نہیں ہے
مرا تو نام بھی رکھا ہوا ہے

☆☆☆☆☆

سمیرا ناز کے افسانوں پر ایک نظر

سمیرا ناز سے میرا تعارف اُن کے چند افسانوں کے حوالے سے ہُوا ہے۔ ''گونجتی سرگوشیاں'' نامی افسانوی مجموعہ میں دیگر خواتین افسانہ نگاروں کے ہمراہ اُن کے بھی چند افسانے شامل ہیں۔ مَیں چاہتا تو نسوانی افسانہ نگاروں کی تاریخ پر دس بارہ پیراگراف رقم کر کے ایک آدھ پیراگراف سمیرا ناز کے لیے مختص کر دیتا لیکن پھر سوچا کہ اُسی پیراگراف پر ہی کیوں اکتفا نہ کیا جائے جسے پڑھنے کی خواہش مصنفہ کو بھی ہو گی اور شاید قارئین کو بھی اور یوں بھی افسانے کی تاریخ لکھنے کا فریضہ تو ایک مضمون نگار نے مذکورہ کتاب میں انجام دے ہی رکھا ہے۔ سمیرا ناز کے افسانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا طرزِ تحریر بننے سنورنے کی منازل میں ہے لیکن ابھی سے اُن کے ہاں الگ ڈگر پر چلنے کی ہمک موجود نظر آتی ہے۔ کسی بھی نثری یا منظوم تحریر میں دلچسپی کے اسباب میں اندازِ بیان

خاور اعجاز

کی شگفتگی، مطالعہ و مشاہدہ کی وسعت اور سب سے بڑھ کر تحریر میں روانی کا ہونا ضروری ہوتا ہے - مطالعہ و مشاہدہ میں وسعت کوئی جامد چیز نہیں، تجربہ اور عمر کے ساتھ یہ عناصر خود رَو نباتات کی طرح پھلتے پُھولتے رہتے ہیں- یہی حال روانی اور شگفتگی و شائستگی کا ہے جن میں مسلسل مشق سے نکھار آتا چلا جاتا ہے اور تحریر درجہ بہ درجہ عمدگی کی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے تاہم جب کتابی صورت میں تحاریر کو سامنے لانے کا وقت آتا ہے تو مصنف یا مصنفہ کا اِن خوبیوں سے آشنائی کا راز افشا ہو جاتا ہے- سمیرا ناز کے میسر افسانوں کو پڑھنے کے بعد مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ وہ ایک نفیس افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں منظر نگاری کے فن پر خصوصی توجہ دیے جانے کے ساتھ سماجی مسائل کو گہری نظر سے دیکھے جانے کا احساس ہوتا ہے- اُن کے افسانوں میں کہانی پن بھی ہے، کردار نگاری بھی اور زندگی کے کینوس سے چُنی گئی ایسی تصاویر بھی جنھیں سمیرا ناز کی آنکھوں نے دیکھا، ذہن نے پرورش کی اور قلم نے صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا- یہ امر مزید مسرت کا باعث ہے کہ مذکورہ افسانوی مجموعہ میں شامل ''سرگوشیوں'' میں اُن کی ''سرگوشیوں'' کی گونج دب کر نہیں رہ گئی- اُن کے افسانے عہدِ حاضر کے ادبی میلانات و رجحانات کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں جن میں سادگی بھی ہے اور ضرورت کے تحت علامتی انداز بھی اختیار کیا گیا ہے لیکن حقیقتِ حال کو لفظیات کے بوجھ تلے دبایا نہیں گیا اور اسلوب تراش لینے کی خواہش میں تکنیکی اُلجھن سے گریز کیا گیا ہے تاہم تازگی پر سمجھوتہ نہیں کیا گیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قاری کو گرفت کرنے کا ہنر جانتی ہیں- وقت کی کمی کے باعث مَیں اُن کے افسانے ایک ہی نظر دیکھ سکا ہُوں، موقع مِلا تو کچھ وقفہ سے دوبارہ پڑھوں گا، اگر میرے اگلے مطالعہ میں افسانوں کی دُوسری پرت دریافت ہو گئی تو سمجھوں گا کہ میرا مطالعہ اور سمیرا ناز کی محنت اکارت نہیں گئی-

☆☆☆☆☆

اردو زبان کی غیر فطری پیدائش............

زبانوں کی پیدائش اور ارتقا کے حوالے سے اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی زمین پر لوگوں کا ایک مخصوص گروہ اگر کئی صدیوں تک موجود رہے، اور اس کی ثقافت اور کلچر کے خدوخال واضح ہوتے چلے جائیں، ایک دوسرے کے ساتھ اظہار خیال میں بہتری ہوتی چلی جائے اور اس کے ساتھ لفظیات کی تخلیق، صوت اور تاثر سے لفظیات پیدا ہوتی جائے، تو زبان بننے کا عمل جاری رہتا ہے۔ سائنسی معاشی اور سماجی ترقی کے ساتھ جیسے جیسے نئی چیزیں اور نئے عوامل داخل ہوتے جاتے ہیں لوگوں کا وہ گروہ اس کے لیے نئی اصطلاحات متعارف کراتا جاتا ہے۔

زبان کے ارتقائی مرحلے میں ثروت مند ہونے کا دوسرا مرحلہ تب آتا ہے جب کسی اور زبان، کلچر اور ثقافت کے جو اس گروہ کے ساتھ ملتے جلتے ہیں آپس میں کاروبار کرتے ہیں، اشیاء کا لین دین ہوتا ہے، تب دونوں زبانیں ایک دوسرے کو ثروت مند کرتی ہیں۔ اگر ایک زبان دوسری سے کچھ الفاظ مستعار لیتی ہے تو دوسری زبان بھی پہلی زبان سے کچھ الفاظ اپنے اندر شامل کر کے اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جاتی ہے۔ اس مرحلے میں دونوں زبانوں کا تشخص قائم رہتا ہے اور کوئی تیسری زبان جنم نہیں لیتی۔

زبانوں کے ارتقا کا تیسرا مرحلہ وہ ہے جس میں ایک زبان کی تحریر کو دوسری زبان کی تحریر میں منتقل کیا جاتا ہے جس کے لیے مترجم کا دونوں زبانوں میں ماہر ہونا

غافر شہزاد

ضروری ہے- پرانی صرف وہی زبان پڑھی جا سکتی ہے جس کے سامنے اس کا ترجمہ دوسری زبان میں موجود تھا- انڈس ویلی کی زبان اسی لیے ابھی تک پڑھی نہیں جا سکی چونکہ اس زبان کی تحریر کے سامنے لکھی گئی کوئی دوسری زبان نہیں ملی-

اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اردو زبان کی پیدائش غیر فطری دکھائی دیتی ہے- کسی بھی زبان کی پیدائش کے لیے ضروری ہے کہ ایک خاص خطے پر کچھ مخصوص لوگ کئی صدیوں تک اس طرح رہائش پذیر رہے ہوں کہ دوسری زبانوں سے ان کا براہ راست رابطہ نہ ہو پایا ہو- اب یہاں اردو کے حوالے سے دو سوال آپ کے سامنے رکھے جاتے ہیں- پہلا سوال یہ ہے کہ کیا اردو کسی ایسے خطے میں پیدا ہوئی جہاں کوئی اور زبان بولی نہیں جاتی تھی اور کیا اس خطے میں ایک مخصوص تہذیب و ثقافت رکھنے والے گروہ کی قیام پزیری صدیوں تک رہی ہے جو اردو کے علاوہ کوئی اور زبان نہ جانتے تھے؟ اور نہ ہی بولتے تھے؟ یقینی طور پر اس کا جواب نفی میں ہے-

برصغیر پاک و ہند میں کوئی خاص خطہ اور نہ ہی لوگوں کا کوئی خاص گروہ ایسا شناخت کیا جا سکتا ہے کہ جن کی زبان اردو کے علاوہ کوئی اور نہیں تھی- اسی طرح ایسے لوگ بھی شناخت نہیں کیے جا سکتے جن کا کلچر، رہائش، تہذیب و ثقافت، طرز رہن سہن کا تعلق ایک عرصہ تک اپنے ہمسایوں یا دور دراز کی کسی تہذیب سے رہا ہو؟

اب اگر یہ بات درست ہے کہ ایسا کوئی گروہ اور نہ ہی ایسا کوئی خطہ شناخت کیا جا سکتا ہے کہ جہاں اردو زبان محدود پیمانے پر، ابتدائی زبان کے طور پر بولی جاتی رہی ہو، ایسی صورتحال میں یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اردو زبان کی لفظیات اور گرائمر کچھ اور زبانوں سے مستعار لی گئی ہے- یہ وہ قومیں اور زبانیں ہیں جو کئی صدیوں تک کسی خاص خطے میں محدود رہیں، رہائش پذیر رہیں، اپنے مختلف کلچر، ثقافت، تہذیب کے ساتھ زندگی گزارتی رہیں اور یہ زبان الگ سے نشو و نما پا سکی- ان زبانوں میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، پنجابی سندھی، بلوچی، براہوی، و دیگر شامل رہی ہیں-

اس زاویے سے دیکھا جائے تو اردو کا وجود مستعار زبانوں میں شمار ہوتا ہے- اردو کا آغاز بے شک محمود غزنوی کے لشکر کی ہندوستان میں آمد سے ہوا ہو یا حافظ محمود شیرانی کے مطابق یہاں کی پنجابی زبان کے

خمیر سے معرض وجود میں آئی ہو، یہ کسی طرح سے بھی اوریجنل نہیں ہے۔ اسے لشکری زبان قرار دے کر، ایک الگ زبان کے طور پر تسلیم تو کیا جا سکتا ہے مگر اسے کسی خاص گروہ یا کسی خاص خطے میں بسنے والی قوم کی زبان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لشکر کا لفظ مسلمانوں کے لیے بہت دل نشین رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ محمود غزنوی یا محمد بن قاسم، ہر دو کے لشکروں کے ساتھ ہی برصغیر میں آئے تھے، ان کا مقصد علاقے فتح کرنا یا لوٹ مار کرنا تھا۔ اس وقت ان کی زبان عربی اور فارسی تھی عربی زبان قرآن کی زبان ہونے کی وجہ سے مذہبی زبان تھی جس کا پڑھنا اور سمجھنا ہر مسلمان کے لازم قرار پاتا ہے۔ دوسری جانب فارسی زبان میں ایران کی تہذیب و ثقافت اور کلچر کے ساتھ ساتھ تحریری اثاثے بھی موجود تھے جنھوں نے اردو میں شامل ہو کر یہاں کے مسلمانوں کی فکر و دانش کو اجاگر کیا۔

ایک لشکر جو حملے کی غرض سے کسی خطے میں گھوڑوں پر سوار آتا ہے، ہوا کے دوش پر لوٹ مار کرنے کے بعد واپس چلا جاتا کیا، یہ بات عجیب و غریب نہیں ہوگی کہ ایسے لشکر کی زبان کو آپ اردو قرار دے کر اسے اپنا بنا لیں۔ اگر اردو زبان لشکر کی زبان تھی تو لشکر کی تہذیب و ثقافت اور کلچر لوٹ مار کے سوا کچھ نہیں تھا، تو کیا ہم اردو کو ایسے لوگوں کی زبان قرار دے سکتے ہیں جو اس لشکر میں شامل تھے اور جن کی تہذیب و ثقافت لوٹ مار کے علاوہ کچھ نہیں تھی؟ کوئی بھی شخص یقینی طور پر ایک لشکر کی تہذیب و ثقافت کو کسی خاص گروہ کی تہذیب و ثقافت قرار نہیں دے گا تو پھر ایسے حالات میں اس لشکر میں تشکیل پانے والی زبان کو کوئی کیسے اپنا کہہ سکتا ہے؟

ہندوستان میں آریا کی آمد سے پہلے جو بھی زبان تھی، اس کا وجود اس خطے سے ختم ہو چکا ہے۔ آریا کے ساتھ سنسکرت زبان اور تہذیب و ثقافت اس خطے میں آئے اور پھر یہاں کے لوگوں کی زبان اور تہذیب و ثقافت ویسے ہی بن گئی۔ عام بول چال کی زبان اس وقت بھی پراکرت تھی مگر وید سنسکرت میں لکھے گئے تھے اور یہ وید ہندوؤں کی مذہبی کتابیں تھیں۔ یہاں بولی جانے والی مقامی زبانوں پہ جب عربی اور فارسی زبان کے الفاظ بکثرت شامل ہوئے تو زبان کی شکل تبدیل ہونے لگی۔ سب سے زیادہ حملہ آور شمال مغربی سرحد کی جانب سے آتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب میں، پنجابی زبان کے اندر عربی اور فارسی

کے الفاظ شامل ہوتے چلے گئے۔ کسی بھی پرانی زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ کا شامل ہونا کسی نئی زبان کی تشکیل کا سبب نہیں بنتا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جب انگریز یہاں پر آئے تو انگریزی زبان کے الفاظ بھی پنجابی میں شامل ہو گئے اور اسی طرح پنجابی زبان کے الفاظ کا انگریزی میں شامل ہو جانا ایک فطری عمل تھا۔ اب ایسی صورتحال میں ایک نئی زبان کی تشکیل ممکن نہیں کہ جس کی مخصوص تہذیب و ثقافت ہو نہ کوئی مخصوص گروہ اسے بولتا ہو اور نہ ہی وہ مخصوص گروہ کسی ایک خطے میں صدیوں تک اس طرح سے رہائش پذیر رہا ہو کہ اس کا بیرونی دنیا سے رابطہ نہ رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کی تشکیل کو غیر فطری قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے غیر فطری ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ بھی دی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد مسلمانوں کی زبان قرار دینا قابل قبول نہیں تھا اس پر سب سے بڑا اعتراض مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کا تھا کہ جن کی اپنی زبان اپنا کلچر اور اپنا سکرپٹ تھا۔ جب ایک غیر فطری زبان کو ان پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو انھوں نے سخت احتجاج کیا۔ یہ احتجاج پنجاب میں اس وجہ سے بھی کم تھا کہ اردو زبان میں 50 فیصد سے زائد لفظ پنجابی زبان کے الفاظ کی بدلی ہوئی شکل تھی، جو عربی اور فارسی لغت کی وجہ سے قدرے تبدیل ہوئی تھی۔ اس کا سب سے زیادہ نقصان بھی پنجابی زبان کو ہی ہوا کہ ایسی زبان جو ایک فطری عمل کے ساتھ کئی ہزار سال کا سفر طے کر کے اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے تھی یہاں کے کلچر اور ثقافت کی نمائندگی کر رہی تھی۔ یہاں کے لوگوں کے لیے اظہار کا ذریعہ تھی، اسے ختم کر کے اس کی جگہ اُردو زبان کو سرکاری سرپرستی میں رائج کیا گیا۔ نہ تو اُردو زبان کو اپنایا جا سکا اور نہ ہی پنجابی زبان معتبر قرار دی جا سکے۔ ایسے حالات میں اس کا نقصان پنجابی اور پاکستان کے دیگر صوبوں کی نئی نسل کو ہوا کہ جنہیں پنجابی کے بجائے اردو اور اس کے متوازی انگریزی زبان میں تعلیم دینے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو انگریزی زبان کی طرح اردو زبان بھی نوآبادیات کی زبان ہے اور نوآبادیات کا ہی ایک تسلسل ہے جو باقی زبانوں کو پیچھے چھوڑ کر ان کی جگہ لینے کی کوشش میں مصروف ہے۔ جب تک اس معاملے میں شعوری کوشش نہیں کی جاتی، پنجابی زبان کہ جو اپنے

ارتقا میں ایک فطری زبان ہے، کو اردو زبان کہ جو ایک غیر فطری زبان ہے کہ تسلط سے آزاد نہیں کرایا جا سکتا۔ چند دہائیاں پہلے اسپرانتو کو بھی رابطے کی عالمی زبان بنانے کی نہایت سنجیدہ کوششیں ہوئیں مگر اسپرانتو رابطے کی زبان نہ بن سکی۔ ایسی ہی صورتحال اردو کے ساتھ ہے۔ تمام تر کوشش کے باوجود اردو رابطے کی زبان نہیں بن سکی۔

1- پاکستان کا قومی ترانہ اردو میں ہے مگر دعوی یہ ہے کہ اس میں ایک دو الفاظ کو چھوڑ کر باقی تمام الفاظ عربی و فارسی کے ہیں۔ کیا دنیا میں کوئی زبان ایسی تشکیل پائی ہے جس نے اتنے زیادہ الفاظ دوسری زبانوں سے لیے ہیں؟؟

2- زبان ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے تو کیا سمجھ لینا چاہیے کہ اردو زبان فارسی، ہندی، انگریزی اور عربی کلچر و ثقافت کی آئینہ دار ہے؟

3- ہر زبان بولنے والوں کے کلچر، طرز رہن سہن، روزمرہ سے تشکیل پاتی ہے اس لحاظ سے اردو زبان اس کے بولنے والوں کے کون سے کلچر کی آئینہ دار ہے؟ کیا یہ مان لینا چاہیے کہ اردو بولنے والوں کا کلچر ہندی، فارسی، انگریزی اور عربی زبانیں بولنے والوں کے کلچر کو چوں چوں کا مربع ہے، کلی طور پر الگ سے کلچر کی کوئی شناخت نہیں بنتی؟

4- ہر زبان کسی مخصوص خطے میں صدیوں سے رہائش پذیر لوگوں کی کمیونیکیشن سے جنم لیتی ہے اور بعد میں دیگر زبانیں بولنے والوں کے کلچر اور زبان کے الفاظ سے استفادہ کرتی ہے جو کلی طور پر زبان کی اپنی لفظیات کے نصف سے زیادہ نہیں بنتا۔ اردو زبان کے اپنے الفاظ کیا عربی، فارسی، ہندی، انگریزی زبانوں کے الفاظ نکال دینے کے بعد نصف یا اس سے کچھ زائد بچ جاتے ہیں؟

کہا یہی جاتا ہے کہ اردو زبان دہلی شہر اور اس کے گرد و نواح میں بولی جانے والی چار زبانوں (ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا، میواتی و قنوجی) کے ملاپ سے پیدا ہوئی، یہی تو سب سے بڑی دلیل ہے کہ اردو زبان کی پیدائش غیر فطری ہے۔ دنیا میں ایسا کہیں نہیں ہوا کہ ایک زبان پہلے سے موجود ہی نہ ہو اور پہلے سے موجود چار زبانوں کے الفاظ کے ملاپ سے نئی زبان پیدا ہو گئی ہو، اگر ایسا ہے تو اس بارے ضرور بتایا جانا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

دھوپ کی منزل چھاؤں تو نہیں

جمیل احمد عدیل

سلمیٰ صنم کا نام اردو افسانے کے معتبر اسما کی فہرس میں میرٹ پر درج ہے۔ موضوعاتی تناظر میں ندرت کے مصدر سے پیہم انسلاک ہماری اس افسانہ نگار کے ہاں مشروط اہتمام قرار پائے گا تو شبد کا چناؤ ہو یا جملے کی ساخت؛ وہ سبک سے وابستہ کسی جہت پر سمجھوتے کی قائل نہیں۔ یوں شور مچاتی آرائش کو عمداً منہا کرتی ہوئی ان کی Knitted Well نثر قاری کے لیے انجذابی خاصیت رکھتی ہے۔ تکنیک، ٹریٹ منٹ اور اسلوب نگارش اگر دراک خواننده کو اجزا میں کہیں منقسم دکھائی دے جائیں تو اس کی نگاہ میں افسانی تھیم کا امتیاز زمیں بوس ہونے لگتا ہے۔ سلمیٰ صنم مذکورہ بخروں کو وحدت میں گوندھنے کی مشقت میں بھی مبتلا نہیں ہوتیں۔ وہ ان تمام عناصر پر مشتمل سالم سموچی سنہری اکائی متخیلہ کی حریم سے بلاواسطہ وصول کرتی ہیں۔ ظاہر ہے اس ضمن میں ذاتی گواہی تو موجود نہیں۔ البتہ زیر نظر مجموعے میں شامل کہانیوں کا Texture Organic شاہد ہے کہ قرطاس پر عبارت کو کتر بیونت کے میکانکی عمل سے گزارنا، یہ افسانہ نگار اسے تخلیقی

شان کے منافی یقین کرتی ہیں۔ ہر کہانی کی رواں دواں قرأت ہی کافی ثبوت ہے کہ لکھنے والی نے تسوید کو آخری مرحلے میں رکھا ہے۔ نشوونما کی تمام تر ساعتیں سکوت کے کوبے (Cocoon) ہی میں بیتی ہیں۔

سلمیٰ صنم نے اپنی ذات میں ہمہ دم جاری تانیثی لہروں سے درد کی صفت کشید کی اور تربیت یافتہ ذہن میں براجمان تذکیری موجوں سے معروضیت کا جوہر پایا۔ اس طرح یہ لطیف امتزاج متکلم ملے گا کہ ان افسانوں کا خالق ایک مکمل فرد ہے۔ بلاشبہ یہ افسانے کرب کی شدتوں کو متون کے بطون میں مضمر نہیں جذب کر لینے میں بامراد ٹھہرے ہیں - یہی کارن ہے کہ انھیں پڑھتے ہوئے قاری کی آنکھوں میں نمی نہیں تیرتی مگر قلب گداز سے معمور ہو جاتا ہے۔

سلمیٰ صنم افسانے کو 'حقیقت' اور 'علامت' کے روایتی خانوں میں بانٹنے کی شعوری کاوش کو کرافٹسمین شپ کا شعبدہ گمان کرتی ہوں گی۔ اسی لیے انھوں نے ان دونوں معروف منطقوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ایک نیارا اور نرول نعم البدل دریافت کرنا چاہا۔ اسے فکشن کی یکسر علاحدہ گمک سے موسوم کیا جانا غالباً بے جواز نہ ہوگا۔ گویا اس الگ 'افسانی گونج' کا ظہور صرف اس فکشنی نثر ہی میں ممکن ہے جو ایک طرف اکل کھری زیست کی ترجمانی سے انحراف کا عندیہ نہ دے اور دوسری جانب فینٹسی ٹائپ کسی مصنوعی کیفیت کی طلسم کاری (سرئیل ازم) پر مامور بھی نظر نہ آئے - سلمیٰ صنم نے اس Resonation کو مدھم رکھ کر اس کے Vehemence کو سوا ہونے کا موقع دیا۔ یوں ان کے افسانے زمین سے جڑ کر اپنا افسوں قائم کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ فکشن اور نان فکشن کے بیچ واضح لکیر بھی کھینچتے ہیں۔

مثال کے طور پر ان کا افسانہ 'بانس کا آدمی' ایک قابل توجہ تحریر کہلائے گی۔ یہ قاری کو کمال آہستگی سے اپنے ہمرکاب کر لیتی ہے اور وہ خود کو وضع کردہ فضا کا حصہ جاننے / ماننے لگتا ہے۔ یہ امر موجب تعجب نہیں ہونا چاہیے اگر متذکرہ افسانے کی خواندگی کے دوران کسی پڑھے لکھے کا دھیان سکاٹ رسل سینڈرز کے مضمون 'فطرت کی حمایت میں' کی طرف منتقل ہونے لگے! لیکن امر واقع یہ ہے کہ محولہ افسانے میں فلسفۂ ماحولیات (Ecology) (Deep یا بن نگاری Wilderness) (Writing پر مبنی علمیاتی مباحث

کا پرتو قطعاً نہیں ملے گا۔ اس کے برعکس نیچر کے نادرانگ سے لپٹا یہ افسانہ خالص تخلیقی اکناف کا بھرپور اور اوریجنل نامیاتی پیکر ہے۔ اس میں قدرے حیران کن ثقافتی اوضاع، معاشی سروکار، سماجی قضایا اور انسانی جذبے آپس میں یوں اندر تک اترے ہوئے ہیں کہ کسی دھاگے کو دوسرے دھاگے سے جدا کرنا سہل نہ ہوگا۔ اگرچہ اس افسانے کے لیے 'مقاماتی ادب' کا تسمیہ موزوں رہے گا لیکن یہ کوئی محل اعتراض بات نہیں۔ کیا ہوا اگر لٹریچر کی یہ نوع مکاں کی آئیڈیل وسعت کو قبولنے میں متامل رہتی ہے لیکن ماحولیات کا اثبات اسے تحدید کے باوصف سرفراز کرسکتا ہے' (۱) شرط ہر بار یہی ٹھیرے گی کہ فنی مقتضیات کو کس درجے میں نباہا گیا ہے؟ اور 'بانس کا آدمی' اپنی 'پلیس' میں اسیر ہو کر بھی پیس آف آرٹ ہے۔

اس لیے کہ پلیس' یا جگہ کی مذکورہ طرف بھلے ہی جغرافیے کی اسارت قبول کرتی دکھائی دے لیکن سائبر کے جہانِ نو نے سارا منظرنامہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ آخر یہ افسانہ اپنے حدود اربعہ سمیت وہاں بھی پہنچ ہی گیا جہاں مقیم قاری کی بصارت نے نظارگی کے عمل میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ اب فرد کا جسمی سطح پر کہیں خود جانا/ پہنچنا قدیمی مفہوم سے نجات پا چکا۔ Virtual Reality سے وابستہ تخلیقی تجربہ کو مختلف مقامات کا دورہ کرنے یا ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرنے دیتا ہے جو حقیقی دنیا میں نہیں۔ نقل مکانی کا عمل اس دم محض ایک رخ قرار پائے گا کہ اب ایک ہی سپیس میں متعدد Dimensions غیر جسمی قیام کے امکان کو صراحت سے ظاہر کر رہی ہیں:

''گلوبلائزیشن اور ڈیجیٹل دنیا نے ادب کے تصور اور ادیب کی 'جگہ' کو ایک نیا تناظر دیا ہے۔ پہلے جہاں ادب ایک مخصوص جغرافیائی حدود میں مقید تھا، اب انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور عالمی تعلقات نے ادیب کی 'جگہ' کو عالمی سطح تک بڑھا دیا ہے۔'' (۲)

مطلب یہ کہ سلمیٰ صنم کا افسانہ: 'بانس کا آدمی' چاہے ایک خاص محل وقوع کا پیش کنندہ 'متعین' ہو لیکن یہ 'تعین' حتمی نہیں کہ حال کی گھڑی میں خواندہ کی نئی روشنی سے معمور آنکھ نے سارے ماحول کو نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ لیا ہے کہ ادب میں جگہ کا تصور، ادیب کے مقام سے جڑے نظریے پرانے ہو چکے۔ اب متن کو ایک منطقے میں رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ مقام/ پلیس

نے اب ہر ریڈر کی تتلی میں اپنی جگہ بنانی ہے، جو دوسرے کے خیال سے مختلف ہو گی۔ کوئی کیا کر سکتا ہے کہ ادب نے ترسیل کے ایسے وسائل تلاش کر لیے ہیں جن کا پہلے خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

'آرگن بازار' بھی اپنی پیشکش کے لحاظ سے ایک اچھوتی کہانی ہے۔ یہاں بھی معیشت کا 'ازلی ستم' کسی اقتصادی فلاسفی کا براہ راست مظہر نہیں بنا۔ کردار اکنامکس کی کسی تھیوری پر باہمی جدال میں محو نہیں۔ وہ تو ناداری کے گھاؤ کھائے ہوئے ہیں۔ یوں افسانہ اپنی کلیت سمیت وجودی کرب کا مسموم کانٹا ہو کر سیدھا سینے میں پیوست ہو جاتا ہے۔ بھلے ہی ایثار اور تحریص قدیم سے چلے آ رہے ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ حال کے ماحول میں وہ کون سا منفرد پرت سامنے لاتے ہیں؟ تو یہ افسانہ نیو لبرل ازم کے شاخسانوں کو خوبی سے سمیٹتا ہوا باور کراتا ہے کہ 'نرخ پرچی' سے اب کوئی عضو 'مبرا' رہا ہے نہ کوئی کلمہ۔۔۔

''بازار عالم میں
سانس سے دعا تک
موسم سے بوسے تک
کچھ بھی
پرائس ٹیگ کے داغ سے
پاک نہیں''

اسی طرح 'ایک مہلک سچ' کا متن نعرہ اچھالے بغیر قدرتی وسائل پر سرمایا دار کے تسلط کو موضوع بناتا ہے۔ یہاں محاضرات انسانی المیے میں ہنرمندی کے ساتھ پروئے گئے ہیں۔ افسانہ پڑھ کر تاثیر کا گہرا نقش لوح دل پر مرتسم ہوتا ہے اور چپ کا حشر لیے ہوئے تمنا بیدار ہونے لگتی ہے کہ صالح کی اونٹنی کو کونچوں سے تہی کرنے والے پھر عبرت کا نشان بنیں کہ آخر کب تک لوگ باگ فلورائیڈ زدہ پانی پی کر اپنے پاؤں کی ہڈیوں کو معکوس کرتے رہیں گے، کب تک بچے ڈینٹل فلوروسس کے زہر سے اپنے دانتوں کی بربادی کا تماشا دیکھتے رہیں گے!!!

حواشی

۱۔ تفصیل کے شائق ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کی مترجمہ کتاب: ''ماحولیاتی تنقید: نظریہ اور عمل'' کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

۲۔ ڈاکٹر رفیق سندیلوی

☆☆☆☆☆

''اردو ناولوں میں دیہی معاشرت'' (ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ)

اردو ادب میں ناول ایک ایسا صنفِ ادب ہے جس نے معاشرے کی داخلی ساخت، سماجی رویّوں اور تہذیبی قدروں کو نہایت گہرائی کے ساتھ محفوظ کیا ہے۔ خصوصاً برصغیر کی دیہی زندگی، جو صدیوں سے تہذیب و ثقافت کی اساس رہی ہے، اردو ناول میں ایک مستقل اور بامعنی موضوع کے طور پر جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔ ڈاکٹر طارق مجید کی تحقیقی تصنیف ''اردو ناولوں میں دیہی معاشرت'' اسی تسلسل کی ایک وقیع اور مستند کڑی ہے، جس میں پاکستان کے قیام کے بعد کے ابتدائی افسانوی عہد (1947 تا 1960) میں تحریر کیے گئے ناولوں کا جامع مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر طارق مجید گزشتہ پچیس برسوں سے درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں اور اردو نثری ادب، بالخصوص تحقیق و تنقید، ان کی فکری دلچسپی کا مرکز ہے۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین ملک کے معتبر علمی و ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں، جس سے ان کی علمی سنجیدگی اور تحقیقی مزاج کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب ان کے اسی علمی سفر کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔

اس تحقیقی کام کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے محض ناولوں کے موضوعاتی تعارف پر اکتفا نہیں کیا بل کہ دیہی معاشرت کے سماجی، تہذیبی، معاشی اور نفسیاتی پہلوؤں کو تنقیدی بصیرت کے ساتھ پرکھا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کے ابتدائی برس ایک ایسا دور تھے جب معاشرہ فکری، سماجی اور تہذیبی سطح پر شدید تغیرات سے گزر رہا تھا۔ ہجرت، نئی ریاست کی تشکیل، دیہی و شہری اقدار کا تصادم اور سماجی ڈھانچے کی ازسرِ نو تشکیل جیسے عوامل نے اردو ناول کو گہرے اثرات سے ہم کنار کیا۔ ڈاکٹر طارق مجید نے ان تمام عناصر کو دیہی پس منظر میں تخلیق پانے والے ناولوں کے حوالے سے نہایت مدلّل انداز میں واضح کیا ہے۔

حمید قیصر

اگرچہ 1947 سے 1960 تک کا عرصہ زمانی اعتبار سے محض تیرہ برسوں پر مشتمل ہے، تاہم اس مدت میں لکھے گئے ناول فکری اور فنی لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ مصنف نے اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ اس دور کے ناول دیہی معاشرت کی قدیم روایات، طبقاتی تقسیم، جاگیردارانہ نظام، دیہاتی اقدار اور انسانی رشتوں کی نزاکت کو نہایت صداقت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحقیقی کتاب کی اشاعت کے بعد ان ناولوں کی ادبی اہمیت مزید مستحکم ہو جاتی ہے۔

کتاب میں دیہی معاشرت کی افادیت اور معنویت کو جس انداز میں واضح کیا گیا ہے، وہ اردو تنقید میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ مصنف نے ثابت کیا ہے کہ دیہی زندگی محض ایک پس منظر نہیں بل کہ اردو ناول کی فکری اساس بھی ہے، جہاں سے سماجی شعور، طبقاتی کشمکش اور انسانی اقدار کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ تصنیف اردو ناول کی تفہیم کے لیے ایک ناگزیر حوالہ بن جاتی ہے۔ جیسا کہ معروف شاعر، محقق و دانشور ڈاکٹر نثار ترابی نے کتاب کے پس ورق پر بجا طور پر لکھا کہ ''چار ابواب پر مشتمل اس تحقیقی کام میں مصنف نے ''اردو ناولوں میں دیہی معاشرت'' پر مبنی موضوع کی فکری، فنی اور موضوعاتی قدر و قیمت اور امتیازی حیثیت کا احساس دلایا ہے۔ مصنف نے اُردو کے رجحان ساز ناول نگاروں کے ہاں دیہی معاشرت کی عکاسی کو ان کے ناولوں میں تلاش کرتے ہوئے ان کی متنوع فکری و فنی جہتیں نمایاں ہیں، جو موضوع کے حسب حال بھی ہیں اور ناول کی اس روایت کی پہچان بھی، جو قیام پاکستان سے 1960 تک کے دورانیے میں موضوعاتی اعتبار سے بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ آزادی کے بعد کے افسانوی عہد کو بنیاد بنانے والے اس اہم تحقیقی کام کی تکمیل پر ڈاکٹر طارق مجید قابل مبارکباد ہیں۔''

مجموعی طور پر ''اردو ناولوں میں دیہی معاشرت'' ایک سنجیدہ، وقیع اور معیاری تحقیقی کتاب ہے جو نہ صرف طلبہ و محققین بل کہ اردو ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔ پاکستان کی آزادی کے بعد کے افسانوی عہد کو بنیاد بنا کر کیا گیا یہ تحقیقی کام اردو تنقید کے سرمائے میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ اس اہم اور معیاری تصنیف کی اشاعت پر ڈاکٹر طارق مجید بلاشبہ مبارکباد کے مستحق ہیں، جنھوں نے اردو ناول نگاری کی روایت کو تحقیقی وقار کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔

☆☆☆☆☆

دورانیہ [نوید صادق]

'دورانیہ' کی پہلی نظم 'میں داستانوں کا آدمی ہوں' درحقیقت ایسا نکتہ آغاز ہے جسے اِس کتاب کا ابتدائیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اِس نظم کے اثرات کتاب میں موجود ہر دوسری نظم پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ عمل اور ردِعمل یعنی ڈسکورس سے عبارت خیال، جذبہ، احساس اور فکر کی توسیع و تسلسل کا یہ عمل غیر ارادی سہی، مگر اِس اعتبار سے خوش آئند ہے کہ شاعر اُس مرکز سے اور ماخذ سے مکمل آگاہ اور مانوس دکھائی دیتا ہے جو نظم گوئی کے اِس داستانوی عمل میں متخیلہ کی تحریک اور نوکِ قلم کی دائرہ وار گردش کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ انتساب والدہ (مرحومہ) کے نام ہے۔ انتساب کے اِسی صفحے پر نوید صادق کا یہ شعر درج ہے:

وہ شام، وہ ہم، وہ تم، ... زمانہ
دورانیہ مختصر رہا ہے

.....

غزل کے اِس شعر میں نوید نے والدہ کے ساتھ اپنے گزرے ہوئے وقت کو یاد کر کے جس shorter time span کی بات کی ہے، اُس کا ماتم و گریہ اپنی جگہ برحق، مگر اِس کے برعکس نوید صادق کی اِن نظموں کو دیکھیں تو کہنا پڑتا ہے کہ یہاں قاری کو جس زمانی دورانیے کا سامنا ہے وہ مختصر اور مربوط نہیں، نامختتم اور منتشر حالتوں میں ہے۔ وقت کا یہ داستانوی تصور ہے اور

شاہین عباس

داستان کے اجزا سے استفادے کی تکنیک اِن نظموں کی صورت گری اور فضا سازی میں جا بہ جا استعمال ہوئی ہے۔ مگر نوید نے اپنی اِس داستان کو تخاطب یا ہم کلامی تک محدود نہیں رہنے دیا بل کہ بین السطور مکالمے کے اضافے سے خود کلامی کی صورت بھی پیدا کی ہے۔ یعنی داستان کوئی کے اِس دورانیے میں چوپال کا ایک ظاہری وجود ہے اور ایک باطنی وجود۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کا رُخِ سخن اگر ایک وقت میں مجمعِ عام کی طرف ہے تو اگلے ہی لمحے اُس کی نظر مجمعِ خاص پر جا پڑتی ہے۔ دونوں داستاں سراوں کے نکتۂ اتصال تک پہنچ کر ہی اِن نظموں کے اسرار کو دریافت کیا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں، نوید کی ان نظموں میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں 'خاص' اور 'عام' کا یہ امتیاز بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اِن مقامات پر شاعر تفریق و تشکیک سے بے نیاز، اپنے مخاطب کے لیے خالی جگہیں چھوڑتا اور انھیں پُر کرنے کی ترغیب دیتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ کتاب میں پیش رفت اور پیش قدمی کی خاموش نظر آنے والی صورتِ حال سطحِ قرطاس پر ہوائی رخنوں سے واضح کی گئی ہے جیسے کسی لاوجود کا کوئی بیانیہ ہو مگر یہ لاوجود سطحِ عالم پر کوئی نہ کوئی وجود ضرور رکھتا ہے؛ ایک ایسا وجود جس کی توجہ سخن سے زیادہ روحِ سخن کی ترتیب و ترسیل پر ہے اور روحِ سخن جس کے دکھ درد کا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے، دھرم کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہے۔ اب اِن ہوائی رخنوں کا پروردہ خلا باہر کا آدمی بھرے یا اندر کا آدمی، جو اہل ہوگا، وہی 'خاص' بھی قرار پائے گا۔ یعنی نوید کی اِن نظموں میں دو کردار ہیں اور دونوں کو مرکزیت حاصل ہے:

''یہ کون لوگوں کے مسکنوں کے کھنڈر ہیں بھائی!
یہ کون لوگوں کے معبدوں کی نشانیاں ہیں
یہ بوڑھا برگد بتائے شاید!
میں دادی اماں سے پوچھتا ہوں
ہمارے آنگن میں پہلے پہلے جو اک شجر تھا
وہ کیا ہوا ہے'' (نظم: میں داستانوں کا آدمی ہوں)

.....

میں نے اِن نظموں میں خالی جگہوں کی جس موجودگی کی طرف اشارہ کیا ہے، اُس کا ایک اظہار نظم ''لیکن میرا دم گھٹتا ہے'' میں کچھ یوں ہوا ہے:

''ایسا بھی اک قصہ ہے جو

مجھ سے تم تک پہنچا ہے
خالی ہاتھوں، خالی دامن، جھول بھرے الفاظ
لیے میں اُس دہلیز پہ آ بیٹھا ہوں
جس سے آگے سارے جھگڑے مٹ جاتے ہیں
یہ بھی تم نے بتلایا تھا
یہ جو میرے ماتھے پر کچھ آڑھی ترچھی...!!"

.....

نوید نے اِس آخری لائن پر اپنی بات خود ہی کاٹ دی ہے۔ قاری کو نظم کی تکمیل میں شریک کیا ہے کہ وہ سوچ سکے کہ ماتھے پر موجود آڑی ترچھی جن چیزوں کا ذکر ہے، اگر وہ آڑی ترچھی لکیریں ہی ہیں تو یہ لکیریں مل جل کر کس نقشے کو جنم دیتی ہیں؛ جدا جدا ہوں تو کیسے کیسے نقوش و نفوس کی بنیاد گزار ہو سکتی ہیں؛ کسی تحریر میں آئیں تو کس تہذیب و تاریخ کا متروک رسم الخط قرار پائیں اور پھر یہ کہ ایسی لکیریں زمان و مکان کی تقویم میں کیسی بے لحاظ و بے اعتبار ثابت ہوئی ہوں گی جن کی مکمل تصویر کشی سے پہلے ہی انفرادی و اجتماعی آزادی کا ازسرِ نو تعین ضروری ہو گیا ہے اور اپنی موج میں رواں کلام کو عین وسط سے قطع کرنا ناگزیر سمجھ لیا گیا ہے۔ میری دانست میں ایک اچھی نظم قاری کی تشکیک کو فعال سے فعال تر کرتی ہے اور عملِ تجسس کی اختراعات پر کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں لگاتی۔ نوید صادق نے جس ترتیب و اہتمام اور کثرت کے ساتھ اپنی نظموں میں بولتے بولتے اچانک خاموشی اختیار کی ہے، قاری کے لیے لازم ہے کہ وہ خود کو بڑے انہماک کے ساتھ تہ بہ تہ خاموشی سے اٹھنے والی اِن ساری آوازوں کو کوئی نام دے تا کہ فرد فرد اِس مجموعہ خیال کا داخلی ربط دریافت کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ کتاب میں بعض نظمیں ایسی بھی ہیں کہ اگر اُن میں سے کسی نظم میں موجود خاموشی کے اِن وقفوں کو نظم کے ظاہری متن سے الگ کر کے لکھا جائے تو ایک الگ نظم برآمد ہوتی ہے۔ ایسی ہی ایک نظم "پانی.....افوہ پانی!" ہے۔ نظم میں موجود خالی جگہوں کو ذرا قریب کر دینے سے ایک ایسی نئی نظم کروٹ لیتی دکھائی دیتی ہے جو اپنی parent نظم کے اندر پیوست بھی ہے اور باہر ایک الگ وجود بھی رکھتی ہے۔ آپ بھی دیکھیے:

"نیند کی گولی.....!ایک.....! نہیں
.....!دو چار اکٹھی

پانی!..... کوئی پانی دے گا!
سانس، اکھڑتی سانس.....!!
اچھا..... میں کچھ کرتا ہوں
نیند کی گولیوں کی کڑواہٹ.....! تھوڑی
تھوڑی باقی ہے
کھانستے کھانستے.....!!
پانی!..... کوئی پانی دے گا!'

.....

آپ نے دیکھا، میری اِس جسارت سے ایک نئے خلا کو اپنے زمین پر قدم جمانے کا موقع ملا۔

نظم ''میری آواز سن'' کے اندر سے بھی ایک سے زیادہ نظموں کا خمیر اٹھتا ہے۔ یہ اپروچ نظم کی اکائی کو متاثر کرتی ہے یا نہیں، یہاں اس بات کی اہمیت اِس لیے بھی نہیں کہ نوید کی نظر وقت کے جس غیر منظم اور غیر منضبط دورانیے پر لگی ہے، اُس کے پر اسرار اور خواب ناک شب و روز اپنی شناخت کے لیے چوراہے میں نسب کسی گھڑیال کے محتاج ہیں بھی نہیں۔ مذکورہ نظم کے ضمنی موضوعات میں ایک موضوع آفرینش کا ہے جو روایتی تصور سے یکسر مختلف ہے۔: جیسے:

''کچھ روایت کی معجز بیانی چلی
کچھ رواجوں کی باغی کہانی چلی
اور میں آ گیا''

نظم میں ذرا آگے اِس طرز آفرینش کے ثمرات کا ذکر ہے:

''ایک میں، ایک میں
دوسرا صرف میں
اِس طرف، اُس طرف، میں ہی میں''
(نظم: میری آواز سن)

.....

اِیک عمل تکمیل کو پہنچتا ہے اور تاریخ کی صورت گری کا اختیار شاعر کو حاصل ہو جاتا ہے مگر حسبِ تمنا تاریخ کی سیاہی کو اجالے اور اجالے کو سیاہی میں بدل دینے سے بھی آشوب عالم کا رنگ وہی کا وہی رہتا ہے:

''میں نے تاریخ میں ایک دو دن اِدھر سے اُدھر کر دیئے
حاشیے پر لکھا متن میں ڈال کر
متن کو حاشیے کی طرف کھینچ کر
حاشیے سے پرے
اپنے آقاؤں کے نام جپتا رہا
کام چلتا رہا!'' (نظم: میری آواز سن)

.....

نوید صادق کی نظموں میں تاریخ کا جبر پہلے انسانی مسئلہ بنتا ہے اور اگلے مرحلے میں نفسیاتی پیچیدگیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی ذہنی حالتوں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا عمل جس تیز رفتاری کا متقاضی ہے، نوید صادق اُس شرط پورا اترتے ہیں۔ اگر ''دورانیہ'' میں موجود نظموں کو عنوانات کے بغیر پڑھا جائے اور قاری کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ اپنی مرضی کے عنوان تجویز کر سکے تو نظم بہ نظم یہی ''دورانیہ'' ہی سرنامہ قرار پائے گا۔ داخلی ربط و انسلاک کے ساتھ زمان و مکان کے اندر باہر جاری اِس مسلسل شعری واردات کی بنیاد پر ''دورانیہ'' کو ایک طویل نظم قرار دیا جا سکتا ہے۔

ٹکڑوں میں تقسیم نوید صادق کی زندگی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر دیکھیں تو اُس پر لکھا ہوتا ہے:

''بچے ہاتھ میں چابک تھامے
میرا رستہ دیکھتے رہتے ہیں'' (نظم: الٹی چال)

.....

یہاں نوید کو درپیش ایک اور مسئلہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے اور اندازہ ہونے لگتا ہے کہ اوپر درج ایک اقتباس میں جس پانی کے لیے دستِ سوال دراز کیا گیا ہے، اُس کے ذخائر کہاں کہاں ہو سکتے ہیں اور وہ کن راستوں سے گزرتے ہوئے سوالی تک پہنچ سکتا تھا مگر کہیں گم ہو گیا۔ اذیت سے اذیت بغل گیر ہونے لگتی ہے اور 'پانی' کی تلاش کا یہ سلسلہ کہیں نہیں رکتا۔ یعنی دورانیے کی جس لامتناہیت کا ذکر اوپر آیا وہ نظم بہ نظم موجود ہے اور غیر متعلق نہیں ہوا:

''یہ کیا خبر ہے
جو آج تک اک ادھورے تن سے
اداسیوں کے بھنور میں لرزاں
ہزیمتوں کی کڑی زمیں پر
شریکِ کارِ سخن بدن کو
پہنچ نہ پائی'' (نظم: اپنا خوف)

نوید صادق نے درجہ بہ درجہ گھمبیر ہوتے ہوئے زندگی کے درد کو نظم ''اذیت میں یوں پیش کیا ہے:

''خوشی..... ایک مبہم تخیل ہے جس کے
بدن سے اندھیروں کی چادر ہٹانے کی
کوشش میں گھائل ہوا ہوں
خوشی..... ایک مندر کی مغرور دیوی،
جو میری گزارش کو سن کر
کسی اور دکھیا پجاری کی از حد ادھوری کتھا پر،

کہ شاید
مری بے بسی پر
بہت ہی ملائم سریلے سروں میں،
ہنسے جا رہی ہے'' (نظم: اذیت)

.....

نوید صادق نے 'دورانیہ' کے طول وارض میں ایک تو آگہی کے طلسم کو دریافت کیا ہے اور پھر کسی ماہر نباض کی طرح اُس طلسم سے وابستہ حسیات کے سرمایے میں ایک ایسی حس کا اضافہ کیا ہے جس سے تلاشِ وجود کا زمینی دائرہ بھی مکمل ہوتا دکھائی دیتا ہے اور آسمانی دائرہ بھی:

''میرے چہرے کی جھریوں کو دیکھ
کتنی صدیاں پھلانگ کر میں نے
رات اپنا سراغ پایا تھا
اور اپنے وجود کی پرتیں
کپکپاتی پلک سے کھولی تھیں''

.....

اِس مقام پر ایک بار پھر شاعر کا سلسلہء کلام ٹوٹ جاتا ہے۔ اِس سکتے یا قطعِ کلام کا دورانیہ کتنا تھا، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر ہمکلامی یا خود کلامی کا یہ عمل جس طور بحال ہوتا ہے، آپ اُس کی شدت کا اندازہ اِن مصرعوں سے کیجیے:

''اور وہ منحوس صبح کا تارہ
میری آنکھوں کی روشنی لے کر
شہر سیراب کرتا جاتا ہے'' (نظم: آگہی کے طلسم کی حس)

.....

یہاں شاعر کو وجود کی شناخت و عدم شناخت کا سلسلہ آگے بڑھانے کی تحریک ملتی ہے اور سفرِ ذات کے دورانیے سمیت زمان و مکان سے وابستہ کسی بھی قسم کے متحارب و متجاوز دورانیے کا جواز سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اب قاری ذہنی طور پر آمادہ ہے کہ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے اِدھر کے مصداق، نیرنگیء زمانہ سے ہنر آزما شاعر کی اِس نظم میں کایا کلپ کی سی جادوئی مگر الم ناک صورت کا سامنا کر سکے:

''آگہی کے طلسم سے بے حس
لوگ دیوانہ وار آ آ کر،
اپنے حصّے کی تمکنت لے کر
بے تعین گلی محلوں میں
پھیلتے جا رہے ہیں سرعت سے
اور میں صبح کے اجالے سے
پوچھتا ہوں کہ اے فریب انداز!
میں کہاں ڈھونڈتا پھروں خود کو؟''
(نظم: آگہی کے طلسم کی حس)

☆☆☆☆☆

''شہید جستجو ___ آنس معین''

دنیا میں انسانوں کی اکثریت زندگی کو ایک طے شدہ معمول، ایک مروجہ ڈگر اور ایک سادہ سے واقعے کے طور پر گزار کر رخصت ہو جاتی ہے۔ ان کے لیے سانس لینا، رزق کی تگ و دو کرنا اور سماجی ڈھانچوں میں خود کو فٹ کرنا ہی کل کائنات ہوتا ہے۔ لیکن تاریخ کے ہر موڑ پر کچھ ایسی کم یاب روحیں جنم لیتی ہیں جن کے لیے زندگی کوئی بنا بنایا راستہ نہیں بل کہ ایک تشنہ سوال بن جاتی ہے۔ ان کے لیے وجود کی حقیقت کسی دستاویزی حقیقت کی مانند نہیں، بل کہ ایک ایسی کھوج ہے جس کا کوئی بظاہر سرا نہیں ملتا۔

یہ لوگ زندگی کو گزارتے نہیں بل کہ اسے بھگتتے ہیں، کیونکہ ان کے لیے ہر لمحہ ایک نئی جستجو، ایک نیا اضطراب اور ایک ان مٹ بے چینی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ یہ سفرِ جستجو ان کے مقدر میں ایک ایسی ناقابل برداشت اذیت لکھ دیتا ہے جو بظاہر خاموش نظر آتی ہے مگر اندر ہی اندر روح کو پگھلاتی رہتی ہے۔

آنس معین کا شمار انہی پراسرار اور حساس ترین انسانوں میں ہوتا ہے جن کے ہاں زندگی کسی طے شدہ مفہوم یا لگی بندھی تعریف کا نام نہیں تھی۔ وہ محض ایک شاعر نہیں تھا جو الفاظ کے گورکھ دھندے بنتا ہو، بل کہ وہ شاعر ہونے سے پہلے خود ایک سوال تھا۔ اس کی شخصیت اس بے کلی کا استعارہ تھی جو انسان کو کائنات کے سربستہ رازوں کے سامنے کھڑا کر دیتی ہے۔

آنس معین کا ہر شعر محض قافیہ اور ردیف کا مجموعہ نہیں، بل کہ اسی بنیادی سوال کی مختلف صورتیں اور رنگ ہیں۔ وہ اپنے وجود

افتخار بخاری

کی پرتیں الٹ کر اس سچائی کو تلاش کرنا چاہتا تھا، جو مادیت کے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اس کی شاعری میں جو اداسی اور گہرائی ہے، وہ اسی تڑپ کا نتیجہ ہے جو جواب نہ ملنے پر ایک حساس دل میں پیدا ہوتی ہے۔

آنس معین کے ان سوالات میں وہی گونج اور خوشبو محسوس ہوتی ہے جو پابلو نرودا کی آخری ایام کی تخلیق ''سوالات کی کتاب'' میں ملتی ہے۔ نرودا کے سوالات کی طرح آنس کے سوال بھی بظاہر سادہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن وہ قاری کی روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہ ایسے سوالات ہیں جو کائنات کی وسعت اور اس کی ہیبت کو بیک وقت اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

جن کا مقصد شاید جواب حاصل کرنا نہیں، بل کہ سوال کی اس خوبصورتی کو محسوس کرنا ہے جو انسانی شعور کو بیدار رکھتی ہے، جو انسانی وجود کی بے بسی اور کائناتی عظمت کے درمیان ایک پُل کا کام کرتی ہے۔

آنس معین کی زندگی اس بات کی گواہی ہے کہ بعض اوقات جواب سے زیادہ سوال اہم ہوتا ہے، کیونکہ سوال ہی وہ روشنی ہے جو ہمیں تاریک راہوں میں زندگی کرنے کا حوصلہ (اور بعض اوقات اسے ختم کرنے کا دکھ) دیتی ہے۔

آنس معین کی شاعری کو اگر محض جذباتی یا رومانوی اظہار سمجھا جائے تو یہ اس کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوگی۔ اس کا اصل حوالہ جذبات نہیں بل کہ آگہی ہے اور وہ آگہی جو سہل نہیں، جو مسرت نہیں دیتی، جو ناقابل برداشت ہے، مگر انسان کو اس کے وجود کے مرکز میں لا کھڑا کرتی ہے۔ وہ اپنے اندر کی گہرائی میں جھانکتا ہے تو وہاں اطمینان نہیں، سوالات، اندیشے، خوف اور کرب نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس کی شاعری میں شفافیت ہے مگر سکون نہیں، روشنی ہے مگر آسودگی نہیں۔

آنس معین کا مسئلہ صرف فرد نہیں، کائنات ہے۔ وہ جسم اور روح کے تعلق، وقت اور مکان کی حد بندی، شعور اور لاشعور کے تصادم، اور وجود و عدم کے باہمی رشتے پر غور کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں بار بار تنہائی، جزیرہ، سمندر، آئینہ، در، دیوار اور سایہ جیسے استعارے سامنے آتے ہیں اور یہ محض شعری صنعتیں نہیں بل کہ اس کے باطنی تجربے کی علامتیں ہیں۔ وہ خود کو بھی دیکھتا ہے اور دنیا کو بھی، مگر دونوں کے درمیان ایک ایسی خلیج محسوس کرتا ہے جس کو پاٹنا اس کے لیے ممکن نہیں رہتا۔

اسی تناظر میں آنس معین کو شہید جستجو کہنا محض ایک استعاراتی ترکیب نہیں، بلکہ ایک فکری حقیقت ہے۔ وہ سچائی کی تلاش میں اُس

مقام تک پہنچتا ہے جہاں سوالات جوابوں سے زیادہ وزنی ہو جاتے ہیں، اور آگہی ایک نعمت کے بجائے امتحان اور سزا بن جاتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ راستہ آسان نہیں، مگر اس کے باوجود وہ مصلحت، سمجھوتے اور فکری سہولت کو قبول نہیں کرتا۔ یہی انکار، یہی بے نیازی، بالآخر اس کی تنہائی کو گہرا کرتی چلی جاتی ہے۔

آنس معین کی المناک موت کو اگر صرف ایک ذاتی حادثہ سمجھ لیا جائے تو ہم اس کے فکری المیے کو نظرانداز کر دیں گے۔ اس کا انجام دراصل اُس حساس، باخبر اور باطن میں اترنے والی روح کا انجام ہے جو اپنے عہد کی سطحیت، بے حسی اور بناوٹی پن سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس دنیا کا نہیں رہ پاتا۔ اس کی شاعری اسی عدمِ مطابقت کی گواہی دیتی ہے۔

''شہید جستجو = آنس معین'' محض ایک روایتی تذکرہ یا ایک بچھڑے ہوئے بیٹے کی یاد میں لکھی گئی کوئی جذباتی بیاض نہیں ہے۔ یہ ایک عظیم عالم اور سوگوار باپ سید فخرالدین بلّے کی جانب سے اپنے اس نابغہ فرزند، آنس معین، کے لیے پیش کیا گیا وہ علمی نذرانہ ہے جو محض محبت یا افسوس کے جذبے سے مرتب نہیں ہوا، بل کہ اس کی بنیاد خالصتاً فہم، ادراک اور معروضی تجزیے پر رکھی گئی ہے۔ یہاں کوشش یہ کی گئی ہے کہ آنس معین کی شاعری کو کسی سطحی عقیدت کے بجائے اس کے ٹھوس فکری، فلسفیانہ اور پیچیدہ روحانی پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے۔ یہ کتاب قاری کو یہ نادر موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ آنس کے سوالات کو محض الفاظ کی صورت میں پڑھے نہیں، بل کہ ان کے کرب میں شعوری طور پر شریک ہو، کیونکہ ان سوالات کی بازگشت دراصل ہمارے اپنے وجود کے نہاں خانوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔

آنس معین کا شمار ان تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جن کی پرواز کی بلندی کی وجہ سے وقت انھیں فوری طور پر قبول کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کا کلام ''سہل پسندی'' کے عادی قارئین کے لیے نہیں ہے، اور نہ ہی یہ ایسی شاعری ہے جسے سرسری طور پر پڑھ کر آگے بڑھ جایا جائے۔ آنس کا فن اپنے قاری سے ایک کڑے امتحان کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ مطالبہ ہے مکمل توجہ کا، گہرے توقف کا اور اعلیٰ درجے کی فکری دیانت کا۔ وہ قاری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مروجہ مفروضوں سے ہٹ کر سچائی کا سامنا کرے۔

جو قاری ان شرائط کو تسلیم کر لیتا ہے اور آنس کے فکری سفر کا ہمراہی بنتا ہے، اس کے لیے آنس معین محض ایک شاعر نہیں رہتا، بل کہ ایک شفاف آئینہ بن جاتا ہے۔ ایک ایسا آئینہ

جس میں قاری کو اپنا چھپا ہوا اضطراب، اپنی ان کہی تنہائی اور وجود کی وہ تشنہ جستجو واضح طور پر جھلکتی ہوئی دکھائی دینے لگتی ہے جسے وہ اب تک لفظ دینے میں ناکام رہا تھا۔

''شہید جستجو _ آنس معین'' درحقیقت اسی ''آئینے'' کو سمجھنے، اسے ٹوٹنے سے بچانے اور اس کے سامنے ٹھہر کر خود کو دیکھنے کی ایک سنجیدہ سعی ہے۔ اس تالیف کا مقصد آنس معین کے فن کی ان تہوں کو وا کرنا ہے جو عام نظروں سے اوجھل رہ جاتی ہیں۔

اس کتاب کی کامیابی کا حقیقی پیمانہ یہ نہیں کہ اسے کتنے لوگوں نے پڑھا، بل کہ یہ ہے کہ اگر یہ تحریر کسی بھی قاری کو ذرا دیر کے لیے مادی دنیا کے ہنگاموں سے کاٹ کر اپنے آپ سے ہم کلام کر دے، تو یہی آنس معین کے فن کی معراج ہوگی اور یہی اس کتاب کی تالیف کا اصل ثمر ہوگا۔ اگر آپ ان صفحات کو پڑھتے ہوئے اپنے اندر کی خاموشی سے گفتگو کرنے لگیں، تو سمجھ لیجیے کہ اس کتاب کا مقصد پورا ہو گیا۔

اب ملاحظہ کیجیے۔ آنس معین کے چند منتخب اشعار:

ہے میرے اندر بسی ہوئی ایک اور دنیا
مگر کبھی تم نے اتنا لمبا سفر کیا ہے

.....

سیر چمن کی کرنے والو تم نے سنی تو ہوگی
پاؤں تلے آجانے والے پتوں کی آواز

وہ جو پیاسا لگتا تھا سیلاب زدہ تھا
پانی پانی کہتے کہتے ڈوب گیا ہے

.....

میں بارش کی دعائیں کیسے مانگوں
مری بستی میں کچے گھر بہت ہیں

.....

کبھی میں سورج کو دوں صدا تیرگی کے ڈر سے
کبھی یہ سوچوں کہ برف کا ہے مکان اپنا

.....

جانتے ہو کس قدر خائف ہے اپنے آپ سے
سنگ جیسا آدمی جو کانچ کے اس گھر میں

.....

میری قامت سے ڈر نہ جائیں لوگ
میں ہوں سورج ، مجھے دیا لکھنا

.....

بہت سی باتیں ابھی وضاحت طلب ہیں لیکن
مری کہانی کا حسن ہی اختصار میں ہے

.....

انجام کو پہنچوں گا میں انجام سے پہلے
خود میری کہانی بھی سنائے گا کوئی اور

.....

اسے ملے ہو مگر جانتے کہاں ہو تم
خود اپنے آپ پہ آنس ابھی کھلا کب ہے

.....

کیسے ہم سمجھائیں گے مفہوم کیا خوشحالی کا
دورِ قحط میں جینے والے بھوکے پیاسے بچوں کو

ہر ایک شہر کا معیار مختلف دیکھا
کہیں پہ سر، کہیں پگڑی کا احترام ہوا

.....

اگر نہیں میں آشنا عبادتوں کی رسم سے
چھپا ہوا ہوں کس لیے بدن کی خانقاہ میں

.....

نہ تھی زمین میں وسعت مری نظر جیسی
بدن تھکا بھی نہیں اور سفر تمام ہوا

.....

جب فضاؤں سے ربط بڑھتا ہے
ٹوٹ جاتا ہے آشیانے سے

.....

رہتا ہوں جس زمیں پہ وہی اوڑھ لوں گا میں
جائے اماں اک اور بھی ہوتی ہے گھر کے بعد

.....

ممکن ہے کہ صدیوں بھی نظر آئے نہ سورج
اس بار اندھیرا مرے اندر سے اٹھا ہے

.....

کیا عدالت کو یہ باور میں کرا پاؤں گا
ہاتھ تھا اور کسی کا مرے دستانے میں

.....

میں جستجو میں ہوں آئینے کو کھرچ رہا ہوں
میں رفتہ رفتہ مٹا رہا ہوں نشان اپنا

.....

گہری سوچیں لمبے دن اور چھوٹی راتیں
وقت سے پہلے دھوپ سروں پر آ پہنچی ہے

عجب انداز سے یہ گھر گرا ہے
مرا ملبہ ، ملبہ مرے اوپر گرا ہے

.....

حیرت سے جو یوں میری طرف دیکھ رہے ہو
لگتا ہے کبھی تم نے سمندر نہیں دیکھا

.....

یہ آئینہ تو سچ کہتا ہے لیکن
ہم اپنے زاویے سے دیکھتے ہیں

.....

اس نے بھی یہ سوچا ہے کہ بس ربط نہ ٹوٹے
اک دوسری بستی کا پتہ دے کے چلا ہے

.....

نہ جانے باہر بھی کتنے آسیب منتظر ہوں
ابھی میں اندر کے آدمی سے ڈرا ہوا ہوں

.....

ذرا تو کم ہوئیں تنہائیاں پرندے کی
اب ایک خوف بھی اس آشیاں میں رہتا ہے

.....

میرے اپنے اندر ایک بھنور تھا جس نے
میرا سب کچھ ساتھ ہی میرے ڈوب گیا ہے

.....

چپ رہ کر اظہار کیا ہے کہہ سکتے تو آنس
ایک علیحدہ طرز سخن کا تجھ کو بانی کہتے

☆☆☆☆☆

ماہرِ اقبالیات..... پروفیسر ہارون الرشید تبسم

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا خاندانی نام ہارون الرشید ہے جو محمد ایوب کے گھر 2 اکتوبر 1955 کو پیدا ہوئے، وہ مغل قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور آج کل Y/319، علامہ اقبال کالونی، سرگودھا میں رہائش پذیر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے چار مضامین ''سیاسیات''، ''اُردو''، ''اسلامیات'' اور ''تاریخ'' میں ایم اے کرنے کے بعد ایم فل اقبالیات اور پی ایچ ڈی (اُردو) کی ڈگری حاصل کی اور ڈاکٹر کہلائے۔ وہ درس و تدریس سے 36 سال (1981 تا 2015) وابستہ رہے، اور سرگودھا کے مختلف کالجوں میں فرائضِ منصبی ادا کرتے رہے، آج پاکستان بھر میں علم کی لَو سے روشن کیے ہوئے اُن کے ہزاروں چراغ ضوفشاں ہیں اور معمارانِ پاکستان کے اذہان و قلوب کو منور کر رہے ہیں۔ کالجوں میں اُن کی طلبا کے امور سے خصوصی وابستگی بھی قابلِ ذکر ہے اور سماجی و ادبی تنظیموں سے وارفتگی اُن کا خاصہ ہے۔ وہ سول ڈیفنس اور اسکائوٹنگ سے بھی منسلک رہے، خوش گوار حیرت ہے کہ اُن کو اب تک 20 اعزازات سے نوازا جا چکا ہے جن میں ''صدارتی گولڈ میڈل''، ''ندیم اکادمی گولڈ میڈل''، ''نظریۂ پاکستان کونسل کی جانب سے گولڈ میڈل''، ''تنظیم شہری دفاع ایوارڈ'' اور ضلع کونسل، سرگودھا کی طرف سے ''لائف اچیومنٹ

ریاض ندیم نیازی

ایوارڈ'' شامل ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں بھی بھرپور شرکت کی ہے۔ اُنھوں نے اپنی تصنیفات میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اُن پروگراموں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو اُن سے نسبت رکھتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی 150 سے زائد کتب (جن میں تصنیف، تالیف اور ترتیب و تدوین کردہ شامل ہیں) زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ اِن میں مختلف شخصیات کے فن و خدمات اور نظریات پر کتب بھی شامل ہیں اور ایک کثیر تعداد علامہ اقبال پر لکھی گئی کتب کی شامل ہے۔ اِسی لیے اہلِ علم و ادب اُنھیں ماہرِ اقبالیات کے طور پر جانتے ہیں۔ علامہ اقبال پر ان کی مندرجہ ذیل کتب پاکستان کے قارئینِ شعر و سخن کے زیرِ مطالعہ ہیں:

۱۔ ''اقبال جو اقبال ہے''
۲۔ ''حیاتِ اقبال کا سفر''
۳۔ ''بیت بازی اقبالیات''
۴۔ ''علامہ اقبال بہ حیثیت ادبی نقاد''
۵۔ ''خزینۂ اقبال''
۶۔ ''اقبال کے گوہر شہوار''
۷۔ ''اقبال اور سرگودھا''
۸۔ ''قندیلِ اقبال''
۹۔ ''ڈاکٹر وزیر آغا بہ طور اقبال شناس''
۱۰۔ ''خورشید اقبال''
۱۱۔ ''ڈاکٹر ایوب صابر بہ طور اقبال شناس''
۱۲۔ ''تقاریرِ اقبال''
۱۳۔ ''زاہد منیر مفکرِ اقبال شناس''
۱۴۔ ''ذخیرۂ اقبال''
۱۵۔ ''کائناتِ اقبال''
۱۶۔ ''بیت بازی کلامِ اقبال''
۱۷۔ ''موضوعاتی کلامِ اقبال''
۱۸۔ ''بہارِ اقبال''
۱۹۔ ''نوریۂ اقبال''
۲۰۔ فلسفۂ اقبال اور نیا پاکستان
۲۱۔ اقبال اہلِ بیتؑ کے حضور
۲۲۔ ''ڈاکٹر سلیم اختر بہ حیثیت اقبال شناس

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی 4 کتابیں عن قریب اشاعتی مراحل سے گزر کر زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں جن میں:

۱۔ قومی و ملی مضامین
۲۔ انوارِ پاکستان
۳۔ تفاخرِ پاکستان
۴۔ سرگودھا کے گولڈ میڈلسٹ شاہین

شامل ہیں۔ یہ نہیں کہ پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے اِس قدر تخلیقی و تحقیقی کام کیا ہے اور اِن پر کوئی کام نہیں ہُوا بل کہ ان پر بھی تحقیقی و تخلیقی کام منظرِ عام پر آ چکا ہے جس میں:

۱- پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم شخصیت وفن

۲- ہارون الرشید تبسم کی اقبال شناسی

شامل ہیں۔ اقبالیات کے علاوہ ان کی مندرجہ ذیل کتب نے بھی سرمایۂ اُردو ادب میں شامل ہو کر اُردو ادب کا دامن مالا مال کیا اور تاریخِ ادب کا حصہ بنی ہیں:

۱- ''گہرے سمندر''

۲- ''جہاں نما''

۳- ''قراردادِ پاکستان''

۴- ''نذرِ پاکستان''

۵- ''قراردادِ پاکستان سے قیامِ پاکستان تک''

۶- ''کرچیاں''

۷- ''لالۂ اُردو''

۸- ''علامہ اخگر سرحدی کی ادبی خدمات''

۹- ''اے وطن کے سجیلے جوانو''

۱۰- ''چھے ستمبر قوت ایمانی کا آئینہ دار''

۱۱- ''پرکھ''

۱۲- ''فقیر سرگودھا (علامہ رشک ترابی کی شخصیت وفن)''

۱۳- ''نصف صدی کے خواب ادھورے''

۱۴- ''پاکستان گولڈن جوبلی کوئز''

۱۵- ''پتھروں کے پیرہن''

۱۶- ''تصویرِ پاکستان''

۱۷- ''نوائے انور (شیخ انور گوندی کا فن وشخصیت)''

۱۸- ''آنکھوں کے اُس پار''

۱۹- ''اُجالوں کا سفر''

۲۰- ''جمالِ گلِ حرا''

۲۱- ''جنھیں ہم بھول بیٹھے ہیں''

۲۲- ''اب اُنھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر''

۲۳- ''نوائے شوق''

۲۴- ''گل ہائے شرر''

۲۵- ''میرے عہد ساز''

۲۶- ''گلِ دیدہ ور''

۲۷- ''منور چہرے''

۲۸- ''آفتابِ ادب (ڈاکٹر وزیر آغا)''

۲۹- ''ابراہیم جلیس ایک مطالعہ''

۳۰- ''طفیلِ پاکستان (مجاہد مفتی محمد طفیل گوندی کی شخصیت وخدمات)''

۳۱- ''پاکستان سب کے لیے''

۳۲- معلوماتِ پاکستان''

۳۳- ''شمعِ آگہی (پروفیسر صاحب زادہ عبدالرسول کا فن وشخصیت)''

۳۴- ''گل ہائے سلام''

۳۵- ''متاعِ شاعری''

۳۶- ''جہانِ نثر''
۳۷- ''مادرِ خوشاب (محترمہ حمیدہ اکرام اللہ وڑائچ کی خدمات)''
۳۸- ''سیرتِ رسول کی روشنی میں دفاعِ پاکستان''
۳۹- ''ڈاکٹر انور سدید کی ڈاکٹروزیر آغا شناسی''
۴۰- ''علامہ رشک ترابی کی شخصیت وفن''
۴۱- ''گلدستۂ تقاریر''
۴۲- ''ارمغانِ وطن''
۴۳- ''کردار ساز تقریریں''
۴۴- ''خوشی محمد ناظر کا فن وشخصیت''
۴۵- ''انوارِ ادب (بیادِ ڈاکٹر انور سدید)''
۴۶- ''آؤ بچو! سیر کریں ہم اپنے پاکستان کی''
۴۷- ''ہمارے ایدھی''
۴۸- ''سو عظیم شاعر اور نثر نگار''
۴۹- ''دانشِ صدرنگ (مقبول احمد کا مطالعہ)''
۵۰- ''تصانیفِ ابراہیم جلیس کا جائزہ''
۵۱- ''پچیس اہلِ قلم''
۵۲- ''کندن چہرے، (مقبول احمد کی سوانح)''
۵۳- ''دُرِ عقیدت''
۵۴- ''ہلالِ استقلال''
۵۵- ''ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بہ طور اقبال شناس''
۵۶- ''مضامینِ تبسم''
۵۷- ''زاہدِ پاکستان''
۵۸- ''جاوداں چہرے (تحریک پاکستان کے مشاہیر)''
۵۹- ''اسلام اور پاکستان''
۶۰- ''نوائے اُردو''

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی شہرت کا راز یہ ہے کہ وہ کتابیں لکھ لکھ کر مسودے جمع نہیں کر رہے بلکہ جو کتاب تیار ہوتی ہے وہ زیورِ طباعت سے بھی آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ جاتی ہے یہی اُن کا پلس پوائنٹ ہے۔ کام ہی سے عزت ہوتی ہے اور پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا کار ادب ناقابلِ فراموش ہو گیا ہے جس کے سبب ہم اِن کی قد آور ادبی شخصیت کو سلام عظمت پیش کرتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی چار نئی کتابیں (اقبالیات پر) مارکیٹ میں آئی ہیں:

۱- معراجِ اقبالؒ
۲- تحریمِ اقبالؒ
۳- محافظِ اقبالؒ
۴- اقبالؒ شناس خواتین۔

☆☆☆☆☆

فلسفیانہ اندازِ فکر کا حامل نظم نگار [شہزاد نیّر]

ان کی کتاب کا عنوان بادی النظر میں ہی اپنی جانب توجہ مبذول کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے ''گرہ کھلنے تک'' عنوان ہی اتنا منفرد اور اعلیٰ ہے کہ یہ بات چشم ادراک و امکان کو خیرہ کرنے لگتی ہے کہ یقیناً جہانِ معنی کا ایک سمندر پوری آب وتاب کے ساتھ یہاں موجزن ہوگا:

Shahzad's nazm immediately immerses the reader in the world of curiosity, which results in meaningfulness at end.

اگر ہم ان کی پہلی نظم ''ساختیات'' پر طائرانہ نظر ڈالیں تو وہ نہایت مدلل پیرائے میں اپنے اندر نامکمل رہ جانے والے خوابوں کے بارے میں رقم طراز ہوتے ہیں کہ کیسے وجود کا جبر انسانی تخیل کو جلوہ گری سے روکتا ہے اور ایگزسٹنشل کرائسس تخلیقی عمل میں رکاوٹ یا بیری کیڈ کے طور پر کام کرتا ہے اس کتاب کی دوسری نظم ''ہدایت کار'' ہے۔ یہ نظم شہزاد نیر کو ایک فکر انگیز نظم نگار کے طور پر ہمارے سامنے لا کھڑا کرتی ہے کہ کس طرح انسان کٹھ پتلی بن کر اپنی فکر کی اکائی کھو دیتا ہے۔ یہ نظم پڑھ کر یہ احساس کروٹیں بدلنے لگتا ہے کہ شہزاد نیر ذہنی اور فکری آزادی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا نہایت عمیق نگاہی سے نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں یہ نظم انہیں ایک بلند فکر نظم نگار کے طور پر ہمارے سامنے آشکار کرتی ہے شہزاد نیر کا اندازِ فکر کامیاب و کامران فلسفی کا سا ہے - ان کی نظم ''سقراط'' سیلف

انصر منیر

ایکچو لائزیشن کا عملی نمونہ ہے۔
شہزاد نیر اپنی نظموں میں مختلف کرداروں کو بڑی مہارت سے ایک ماہر سنگ تراش کی طرح تراشتے ہیں اور پھر ان کرداروں میں فکر و تحرک کی روح پھونک دیتے ہیں۔
وہ اپنی نظموں میں جامد نظریات کی ترویج نہیں کرتے بل کہ زندہ و جاوید حقیقتوں کے بارے میں سوال اٹھانے پر مُصر دکھائی دیتے ہیں ان کی نظم ''تجسس گرہ کھولتا ہے''

This is an impeccable
insignia of curiosity

میرا شعور یہ کہنے پر مُصر ہے کہ تجسس شہزاد نیر کے جینز میں رچا بسا ہے وہ اپنے اردگرد پھیلے نظام رنگ و بو اور نیست و ہست کے متعلق سوال اٹھاتا ہے اور سوال وہی پوچھ سکتا ہے جو متجسس ہو اور جو حقیقت کے روبرو ہونا چاہتا ہو شہزاد نیر کا تعلق اسی قبیل سے ہے۔ ان کی نظم ''سراب'' میں یاس و حسرت کو دلچسپ انداز میں اظہار کا پیرہن عطا کیا گیا ہے، ''دور تک کوئی نہیں'' نظم میں ایک تحیّر باہیں پھیلائے کھڑا دکھائی دیتا ہے، ان کی نظم ''کفن چور'' غربت و افلاس کے مارے انسانوں کی مجبوریوں کا نوحہ ہے اور شہزاد نیر کا انداز انقلاب کی حدوں کو چھوتا دکھائی دیتا ہے اور یہ نظم پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ کیسے ان کے اندر کا درد مند تخلیق کار انھیں ان معاشرتی حقائق کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنانے پر اُکساتا ہے۔ وہ نظم ''اساطیر'' میں طبقاتی تقسیم جیسے ناسور پر نوحہ کناں ہیں اور اس رواج کہنہ کو انسانی پیشانی کا داغ سمجھتے ہیں۔ یہ نظم پڑھ کر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ شہزاد نیر کے ہاں مساوات و برابری جیسے آفاقی نظریات کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے ''ورکنگ وومن'' نظم میں وہ ایک سچے فیمینسٹ کے طور پر نظر آتے ہیں اور میل ڈومینیٹڈ معاشرے میں صنف نازک کی ہمت و استقامت کی بابت بتاتے ہوئے رومان و انقلاب کے سنگم پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں اور صنفی برابری کے علمبردار کے طور پر مظلوم عورت کا مقدمہ لڑتے دکھائی دیتے ہیں:

بیتی یادوں کا
نئی محبت کے وعدوں کا
گھنی گھنیری زلفوں کا
دو ننھے سے کاندھوں پر
تم کتنا بوجھ اٹھاتی ہو
صنف نازک کہلاتی ہو
.....

شہزاد نیر کی نظم ''ویلنٹائن ڈے گل فروش دوشیزہ سے'' پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ہاں عورت کے ساتھ ہونے والی سماجی معاشرتی و معاشی ناانصافیوں کا ان ٹرینچڈ یعنی گہرا احساس موجود ہے وہ عورت کو ایک روایتی مرد کی طرح کسی ایک مخصوص زاویے سے نہیں دیکھتے بل کہ

اس کی روح میں جھانک کر اس کی ازلی محرومیوں کا کھوج لگا لیتے ہیں یہ چیز انہیں ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے:

کتنا چاہا ہے کہ میں پھول خریدوں تجھ سے
اور پھر پیار سے تجھ کو ہی تھما دوں لیکن
آخری پھول کی مہکار تیرے ہاتھوں سے
آج کی شام کا بازار میرے ہاتھوں سے
دھوپ کے ساتھ کہیں اور پھسل جائیں گے
مفلسی ایک طرح وار کیا کرتی ہے

.....

''لوح جہاں نما'' نظم پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ جیسے وہ ایک ایسی سرزمین پر رہائش پذیر ہیں جہاں دوسرا کوئی نہیں ہے اور وہ یکتائی اور انفرادیت سے اپنے دھیان کی کھڑکی سے اپنے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے خود سے محوِ کلام ہے۔

شہزاد نیر کا اختصاص یہی ہے کہ وہ اپنی نظم کے آخر تک آتے آتے قاری کو ایک تحیر کے روبرو کھڑا کرتا ہے تاکہ قاری اپنے شعور کے مطابق اپنی مرضی کے معنی تلاش کرنے کی سعی کرے نظم ''دائرہ صفر ہے'' میں وہ ایک ماہر ریاضی دان کے طور پر اس دنیا کی بے ثباتی کو اپنے خیال کے کینوس میں سموتے دکھائی دیتے ہیں

اس کتاب کی آخری نظم ''نوحہ گر'' ہے جس میں وہ اپنے فلسفیانہ اندازِ تکلم سے تخلیق انسانی اور زمان و مکاں کے وجود کو اپنی چشم تصور سے گزار کر نظم کی صورت میں تخلیق کے سانچے میں ڈھالتے ہیں اور انسانی وجود اور تخلیق کائنات میں ٹرانسفارمیشن، ایولوشن، تھنکنس، ایگزسٹنشلزم ایسے موضوعات کو چھیڑتے دکھائی دیتے ہیں۔

راقم الحروف کے مطابق ''گرہ کھلنے تک'' کی نظموں کا اختصاص یہ ہے کہ ان میں گہرا سماجی شعور، متنوع موضوعات، انسانی جذبات و احساسات کا نفسیاتی تجزیہ، فلسفیانہ اندازِ تکلم، رومان و انقلاب کا امتزاج، گہرائی و گیرائی فکر، کثیر الجہت موضوعات، فیمینزم، منفرد لفظیات و تراکیب کا استعمال، مشکل پسندی، تحیر و تحرک، رجائیت پسندانہ احساس، آفاقیت و عالمگیریت، عصری حسیت، اعلیٰ وارفع اسلوب اور حق گوئی ایسے زندہ و جاوید حقائق موجود ہیں جو ان کے منفرد و اعلیٰ نظم نگار ہونے پر دلالت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ جہانِ معنی کا طلسمِ ہوشربا بین السطور رقصاں دکھائی دیتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

''شہزاد نیر نوجوان شاعر ہیں مگر نوجوانی میں ہی انھوں نے اپنی تخلیقی توانائیوں کا لوہا منوا لیا ہے وہ دونوں اصنافِ شعر نظم اور غزل کو سلیقے سے برتتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان کا جوہر بیشتر ان کی نظموں میں کھلتا ہے۔''

☆☆☆☆☆

یادوں کے پنکھ

شیاما۔ گلیڈو اور سائیں شیاما پان فروش

گلیڈو ایک ایسا آنسو ہے جو رکے نہیں پر ضبط کیا جائے روکا جائے اگر گلیڈو کو مجسم دیکھنا ہو تو وہ لمحہ دیکھیے جب شیاما فلم ،، برسات کی رات،، میں قوالی کی محفل میں بیٹھی اس سٹانزا کو برداشت کرتی ہے--

تیرا عشق میں کیسے چھوڑ دوں
میری عمر بھر کی تلاش ہے

.....

وہ لمحہ مجسم ہوا جہاں گلیڈو بہت قریب سے دیکھا جا سکتا ہے-- یہ پوری قوالی آڈینس کو باندھ کے رکھتی ہے یہ ساحر لدھیانوی کا عجیب نقش ہے-- مدھو بالا، بھارت بھوشن اور شیاما نے فلم میں لیڈنگ کردار ادا کیے-- شیاما ایک سُگھڑ اداکارہ تھی اب بھی حیات ہے اس کے نام کا ایک دیوانہ سائیں شیاما پان فروش تھا جس نے گلے میں اس کے نام کی مالائیں پہن رکھی تھیں-- دکان پر شیاما کی تصویر بھی لگا رکھی تھی-- اس پان شاپ پہ لوگوں کی بہت بھیڑ رہتی میں نے یہ منظر بارہا سید نگری بازار گوجرانوالہ میں دیکھا-

مدھو بالا منظر سے تھوڑا دور روتی ہے بھارت بھوشن ہارمونیم کے لہریے میں اشک بہاتا کرلاتا ہے ساحر کی شاعری -- روشن کی موسیقی اور محمد رفیع- منا ڈے-- آشا بھوسلے- سدھا ملہوترا- -ایس ڈی باتش کی جادوئی جرأت لوگوں کو اپنے ساتھ بہا لے گئی:

نہ تو کارواں کی تلاش ہے
نہ تو ہم سفر کی تلاش ہے
میرے شوق خانہ خراب کو
تیری رہ گزر کی تلاش ہے

.....

برسات کی رات میں شیاما کا رول قدرے چھوٹا ہے مگر وہ منظر نامے میں جتنی دیر رہی

تنویر قاضی

اس نے ماحول اپنی دسترس میں رکھا اس کے موٹے آنسوؤں نے آڈینس کو بھی رلایا اور منظر پر چھائی رہی۔ شیاما کو قوالی میں معلوم ہوا کہ اس کا ہیرو مدھو بالا کا بھی محبوب ہے سو وہ اسے دل پر لیتی ہے اور ہم واضح طور پر موت کو اس کی آنکھوں میں لہراتا دیکھ سکتے ہیں موت کا لہریا اس کے ہونٹوں کے اخروٹ بھی چٹخاتا اظہاریہ بنتا ہے۔ لبوں سے ادا ہوتا موت کا لفظ محفل بھر ماتا ہے وہ کہتی ہے:

میرے نامراد جنون کا ہے علاج کوئی تو موت ہے
جو دوا کے نام پہ زہر دے اسی چارہ گر کی تلاش ہے

.....

اور ان مصرعوں پر قوالی دو آتشہ ہو جاتی ہے

تیرا عشق ہے میری آرزو
تیرا عشق ہے میری آبرو
تیرا عشق میں کیسے چھوڑ دوں
میری عمر بھر کی تلاش ہے

.....

یہ بارہ منٹ کی قوالی پوری حیات ہے سالم ہجر ہے ٹوٹا سا وصل بھی ہے۔ موت شیاما کی صورت میں پوری سج دھج کے ساتھ حشر ساماں ٹھہرتی ہے اس نے مرگ کو ان اشعار میں کتنا سہل کر دیا شیاما نے یہاں مر مٹنے کے باوجود محبت کی شان و شوکت کو گرنے نہیں دیا۔

وہ اپنے اشکوں کے سراب میں جل بن مچھلی بن کر تڑپتی ہے یعنی گلیڈ و گلیڈ و ہو جاتی ہے اس کی آنکھوں میں مرگ کو سرسراتے واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ فلم کی ڈائریکشن بھی اے کلاس ہے۔

ایک ویل سنکرونائیزڈ قوالی میں موت شیاما کو بکھیر رہی ہے جو اس کے ہونٹ اخروٹ لپ سنکنگ سے عیاں کر رہے ہیں اتنا بھر پور اظہار موت کہ موت بھی رشک کرنے پر مُصر ہو۔ موت کو گلے لگانا محبوب کے سامنے جونز رانہ تھا محبت کا شاید۔

وہاں بے اختیاری کو جیسے ہیروئن نے پہنا اور خود سپردگی کو طاری کیا وہ وہ لازوال لمحہ ٹھہرا جس میں سامعین و ناظرین غرق ہو جاتے ہیں اور انھیں موت آسان لگنے لگتی ہے۔

میں نے جب یہ فلم بہت پہلے دیکھنا شروع کی تو مدھو بالا دل و دماغ پر تھی پر جب شیاما اپنے کردار کے ساتھ جلوہ گر ہوئی تو اس کے جادو رنگ میں محو ہوتا گیا کسی غیر معمولی روح

کے سنگ وہ پرفارم کر رہی تھی۔

ریڈیو پر مدھوبالا بھارت بھوشن کی آواز سن کے سیڑھیاں اتر کر محفل قوالی میں چلی آتی ہے اب شیاما کو جانا ہے یعنی جہان سے ہی چلے جانا ہے سو وہ اب موت کی سیڑھیاں چڑھ رہی ہے۔

شیاما کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا کہ کیا قیامت اس پر گزر گئی اگر فلم سے اس کی مرگ کا منظر نکال دیا جاتا تو ناظرین ایک خالی پن سا لے کر سینما گھروں سے گھروں کو لوٹتے ایسا جاندار کردار کبھی کبھار جھولیوں میں گرتا ہے اور پھر کوئی کوئی اسے سنبھال پاتا ہے۔۔

شیاما کی نفسیات میں کہیں یہ چیز برا جمان تھی کہ وہ سائیڈ ایکٹرس ہے سو اس نے کم تر حیثیت سے نکلنے کی کما حقہ کوشش میں مدھوبالا کے ایٹ پار کام کرنا پسند کیا سو وہ بھی کارکردگی کی کسوٹی پر سرنکالتی نظر آئی۔۔

شیاما درگاہ سے خود تعویذ لا کر مدھوبالا کو تھماتی ہے جو اس کی صحتیابی کے بجائے موت کا پروانہ ہے مگر نامہ بر کی مرگ کا دہیں اسے پتہ چل جاتا ہے کہ بھارت بھوشن اور مدھوبالا محبت کے جنگل کے مانس ہیں شباب اس کو دلہن کی طرح سجاتی ہے قوالی شیاما کی سسکیوں اور آہوں سے آغاز ہوتی ہے جس میں شیاما کا انجام مضمر ہے۔

یہاں ضبط کے کئی مقام ہیں جب مدھوبالا اپنے ہیرو کی تصویر شیاما کو دکھاتی ہے جو شیاما کا بھی محبوب ہے تب اس کا بھیتر بھید چھپاتے دائیں جانب سے ہونٹ کاٹ لینا کمالِ ضبط ہی تو ہے اور یہ جیسچر گلیڈ و کو تھامے رکھنے سے سوا ہے۔۔

شیاما کا گلیڈ و سائیں شیاما کے پان بناتے ہوئے کتھے میں شامل ہونے کو بے چین ہوا ہوگا عاشقوں نے تبکا سا اپنی آنکھوں میں محسوس کیا ہو شاید کہ گلیڈ و کبھی گرتا نہیں بھیتر دل کی دیواریں ڈھاتا جاتا ہے شیاما کو دیکھیں وہ ہلی ہلی سی دکھتی ہے جیسے نشے میں ہو۔۔

آخری سین میں شیاما کی روح چھاجوں برستے مینہ میں کسی خیمے سے جیسے نکل کر آ رہی ہو پچھلی محبت کی یاد میں نئے وصال کی زنجیریں پہنتی۔

بھری برسات اور خیمہء شب میں
چھپی خواہش کے پاؤں بھیگتے تھے

☆☆☆☆☆

ایک نایاب ستارہ: نجم الاصغر

میں اپنی گول بتی والی انیس سو بیاسی ماڈل کی جاپانی یاماہا موٹر سائیکل پر، ملتان شہر کے گنجان آباد علاقے کی بھول بھلیوں جیسی گلیوں کے موڑ مڑتا ہوا اپنے عہد کے اس منفرد سخن ور سے ملنے اس کے گھر پہنچتا تھا۔ ان کی اور میری عمر میں ایک واضح تفاوت موجود تھی۔ اس کے باوجود ہم آپس میں پرانے دوستوں کی طرح بے تکلف گفتگو کرتے تھے۔ ان کے لہجے میں خود پسندی کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی تلخی بھی در آئی تھی۔ وہ شاعری میں اپنے سوا کسی دوسرے کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ میرے ساتھ ان کا معاملہ کچھ الگ تھا کہ میں ان کے مزاج سے بخوبی آگاہ تھا۔ میں شروع ہی میں ان کی نظم یا غزل کے کسی شعر کی تعریف کرتا۔

شاہیا صاحب! آپ کی شاعری کے کیا کہنے۔ دراصل ادبی دنیا ابھی تک آپ کے مقام اور مرتبے سے آشنا ہی نہیں ہو سکی۔

دیکھیے فلاں نظم میں آپ نے کتنے عام سے خیال کو فکر کی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔

میری باتیں سن کر ان کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت بھری چمک آجاتی۔ وہ قہقہہ لگا کر کہتے:

''ہاں جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں لفظوں کے معنوی دروبست کو سمجھتا ہوں''۔

کبھی اپنے مخصوص انداز میں کہتے ''افتخار! تمھیں معلوم نہیں۔ جن دنوں میں ملازمت کے سلسلے میں سعودی عرب میں مقیم تھا۔ پہلی دفعہ عمرہ کرنے گیا۔ عمرے کے دوران میں پہلی دفعہ جب میری کعبہ شریف پر نظر پڑی تو میں نے اللہ رب العزت سے شاعری میں برکت کی دعا مانگی تھی۔ یہ اسی کا ثمر ہے۔

ایک روز ان سے ملنے گیا تو مرزا غالب کا دیوان سامنے رکھ کر اس کی غلطیاں نکال رہے تھے۔

''دیکھو بھئی! لوگوں نے خواہ مخواہ غالب کو اتنی اہمیت دے رکھی ہے''۔

میں نے پوچھا، لیکن آپ تو نظم کے شاعر

محمد افتخار شفیع

ہیں- جدید اردو نظم کے شعرا کے بارے میں کیا کہتے ہیں-

شاہیا صاحب! آپ کے خیال میں نظم کا اہم ترین شاعر کون ہے؟- مجید امجد؟

''نہیں یار! وہ تو بہت کمزور شاعر ہے''

---- تو پھر میرا جی؟

''یار! اس کو تو مصرع بنانے کا ڈھب بھی نہیں آتا''-

اچھا تو پھر منیر نیازی کی شاعری کے بارے میں اپنی رائے دیجیے؟

"وہ تو شکل ہی سے میانوالی کا ٹرک ڈرائیور لگتا ہے''-

الماری کے شیلف میں رکھی ''کلیات منیر نیازی'' نکال کر دکھائی- 'افتخار! یہ دیکھو شکل سے ہی میانوالی کا ٹرک ڈرائیور لگتا ہے''-

لیکن شاہیا صاحب! منیر نیازی تو ہوشیار پور کا نیازی ہے- اور چہرے مہرے والا ہے- بڑا خوب صورت انسان ہے-

''نہیں نہیں یار! وہ تمھارے ساہیوال کا ہے، اس لیے اس کی زیادہ طرف داری کر رہے ہو- میں نہیں مانتا''-

اچھا تو پھر ن- م- راشد؟- ''ہاں اس کی کچھ نظمیں اچھی ہیں''-

البتہ علامہ اقبال کو واقعی ایک عہد ساز کہا جا سکتا ہے''-

اس طرح کے مکالمے ہوتے اور ہم آخر کار اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے- شہر کے ایک چائے خانے میں رات کو شہر کے چند شاعر ادیب مل بیٹھتے تھے- ارشد ملتانی، مبارک مجوکا، فرخ درانی، اصغر علی شاہ، جاوید اختر بھٹی، احمد خان درانی، شناور اسحاق، محمد مختار علی، قاضی عابد اور مشتاق کھوکھر اس محفل کا مستقل حصہ تھے - کبھی کبھار اے بی اشرف، ممتاز اطہر، سلیم قیصر، ظفر سپل اور کچھ دیگر لوگ بھی شریک محفل ہو جاتے- نجم الاصغر شاہیا بھی بالعموم ان محفلوں میں موجود ہوتے تھے- ماحول میں ایک خاص قسم کی وضعداری تھی- ان دنوں چائے کی پیالی بھی تریاق کا کام دیتی تھی- جب بھی کوئی علمی بحث چھڑتی تو کسی بزرگ کی طرف رجوع کیا جاتا اور باتوں ہی باتوں میں اس کا حل تلاش کر لیا جاتا- نجم الاصغر شاہیا کی بحث کا انداز سب سے نرالا تھا- وہ بقول شاعر ''اک واری جد شروع ہو جاوے گل فیر ایویں مکدی نئیں'' کے قائل تھے- شعر میں کسی ترکیب کے استعمال کی بات ہوتی تو دوسرے روز لغات و قاموس اور شعرا کے دواوین بطور سند لا کر میز پر پٹخ دیتے- کبھی ناراض ہو کر دوستوں کا بائیکاٹ کر دیتے- لیکن چند روز بعد پھر ویسے کے ویسے معصوم اور بے تکلف دوست- قہقہے لگا رہے ہیں- محبت میں طرح طرح کے جملے سر کر رہے ہیں- نجم الاصغر شاہیا اردو نظم اور غزل کے باکمال شاعر تھے- ان کے بزرگوں کا تعلق اٹک سے تھا، وہاں سے انھوں نے ہجرت

کر کے جھنگ کو اپنی سکونت بنایا اور اس کے بعد تیسری ہجرت جھنگ سے ملتان۔ نجم الاصغر پاکستان آرمی میں ریفریجریشن کے شعبے میں ملازم تھے۔ عمر کے آخری دنوں میں ان کی رضی الدین رضی، عامر سہیل، قمر رضا شہزاد، نوازش علی ندیم، شاکر حسین شاکر۔ کھاریاں میں مقیم امین عاصم سے ان کی گہری دوستی تھی۔

نجم الاصغر شاہیا اپنی مادر علمی گورنمنٹ کالج جھنگ کو بڑی محبت سے یاد کرتے تھے۔ سال اول میں داخلہ لینے گئے تو ان کے نمبر میرٹ سے کم تھے۔ کسی استاد کے پاس گئے اور کہنے لگے میں شاعر ہوں، کیا شاعر ہونے کی وجہ سے بھی مجھے داخلہ نہیں مل سکتا؟۔ وہ پروفیسر صاحب انھیں پروفیسر تقی الدین انجم کے پاس لے جا کر گویا ہوئے، ''یہ لڑکا کہتا ہے، میں شاعر ہوں، ذرا دیکھیں تو سہی''۔ انھوں نے طرح دی اور شاہیا صاحب نے اس پر دو تین شعر کہہ دیئے، تقی الدین انجم (مرحوم) نے ان کے شاعر ہونے پر مہر تصدیق لگا دی اور انھیں داخلہ مل گیا۔ کالج کے دیگر دوستوں میں وہ محمود شام اور رام ریاض کو بہت یاد کرتے تھے۔ دونوں اردو کے اہم شعرا کی فہرست میں شامل ہیں۔ محمود شام کا شمار تو اردو صحافت سے وابستہ اہم لوگوں میں بھی ہوتا ہے۔ نجم الاصغر صاحب نے تسلسل سے شاعری کی لیکن ان کی زندگی کا اہم حصہ معاشی مسائل کو حل کرنے کی تگ و دو میں گزر گیا۔ ان کی زندگی کا ایک اور صدمہ ایک ہی دن میں دو بڑے بھائیوں کا وفات پا جانا تھا۔ ایک بھائی کو دل کا دورہ آیا، دوسرا انھیں ہسپتال لے گیا، جہاں وہ جانبر نہ ہو سکے، یہ خبر سن کر اس بھائی کو بھی دل کا دورہ پڑا، دونوں کا جنازہ ایک ساتھ اٹھا، اس دن میں نے اپنے بزرگ شاعر دوست کو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا۔ شعر و سخن تو کیا زندگی کے ہر شعبے میں شہرت کے حصول کے لیے لابنگ کی جاتی ہے۔ لوگ اپنے اعزاز میں شامیں منعقد کرواتے ہیں۔ ناموری حاصل کرنے کے لیے بعض اوقات ان کی اوٹ پٹانگ حرکتیں دیکھنے والی بھی نہیں ہوتیں۔ انھیں اس بات کا ادارک نہیں ہوتا کہ شہرت یا نیک نامی بھی رزق کی طرح ہے، جتنی تقدیر میں لکھ دی گئی ہو مل کے رہتی ہے۔ نجم الاصغر بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے۔ انھی دنوں ان کا کل کلام ''کلیات نجم الاصغر شاہیا'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ پاکستانی جامعات میں ان پر تحقیق کام ہو رہا ہے، ہمارے شاعر کی نیک نامی کا سورج اب افق لحد سے طلوع ہو رہا ہے:

دل تو بھرتا نہیں چاہے خزینہ مل جائے
شکر کرتا ہوں اگر نان شبینہ مل جائے
ہجرت آساں نہیں ہوتی، یہ ضروری تو نہیں
ہر مہاجر کو اماں گاہ مدینہ مل جائے

☆☆☆☆☆

بٹ (Butt) مطلب لیکن.....

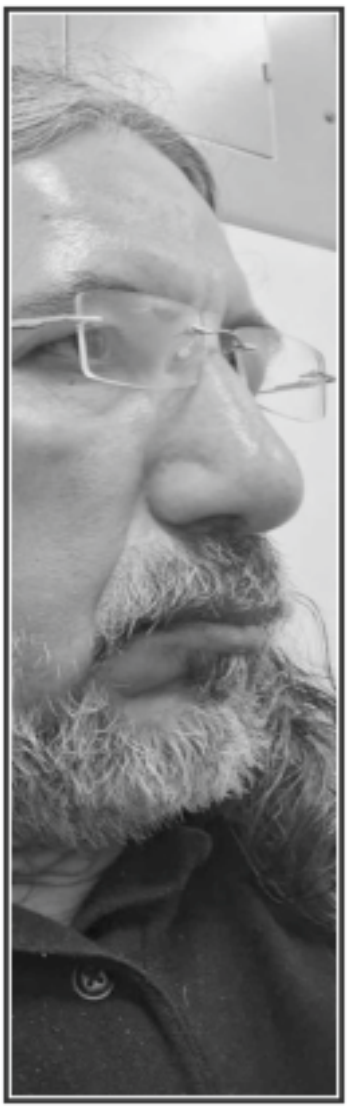

سعید اشعر

بے فکری کے زمانے کا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک سکول فیلو نے بڑی رازداری کے ساتھ مجھے ایک پتے کی بات بتائی۔

فرمایا:

''تم لوگوں کی جھوٹی سچی باتوں پر نظر رکھا کرو تو تم پر منکشف ہوگا کہ لوگ اصل میں وہ نہیں ہیں جو کہ دراصل وہ ہیں۔

اس دن سے میں نے اُس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان دینا شروع کر دیا۔ نتیجتاً چند ہی دنوں میں، میں اس کی دوستی سے مجتنب ہو گیا۔

یہاں مسافرت میں کوئی بھی فرد اس مشغلے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حضرت سلطان باہو فرمایا گئے ہیں کہ: شالا مسافر کوئی نہ تھیوے ککھ جناں تو بھاری ہو

لیکن اس کے بالکل برعکس طارق اقبال بٹ صاحب کی چھوٹی چھوٹی باتیں آپ کو خود اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور ساری زندگی پیچھا چھوڑنے کا نام تک نہیں لیتیں۔

''عمر میری تھی مگر اس کو بسر اُس نے کیا''

میں ایک سال کی بیروزگاری کا شکار رہنے کے بعد پاکستان واپس جا رہا تھا اور اسی قصد پر یقین تھا کہ اگر پیچھے مڑ کر دیکھا تو پتھر کا بن جاؤں گا۔ میرے بیسیوں اقربا اور دسیوں اعزا میں سے کسی نے بھی یہ رسک

لینا مناسب نہیں سمجھا کہ مجھ سے پوچھتا:
''تمھیں سو پچاس ریال کی ضرورت ہو تو بتاؤ''
سوائے بٹ صاحب کے۔ مجھے ایک طرف لے گئے اور کہا۔
'میاں! خالی ہاتھ بچوں کے پاس کیسے جاؤ گے۔ یہ کچھ رقم رکھ لو اور ان کے لیے کھلونے وغیرہ لے لینا۔''
لگے ہاتھوں ایک اور چھوٹا سا واقعہ بھی سن لیں یہاں ایک صاحب ہوا کرتے تھے۔ اس بات پر تقریباً سب کا اجماع تھا کہ وہ معقول انسان نہیں۔ محمود شاہد کو ان کے ایک مجموعۂ کلام کے لیے انعقادِ تقریب رونمائی کا دورہ پڑا۔ احباب میں سے کوئی اس تقریب میں بصد افتخار شامل ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ محمود شاہد نے اس کارِ خیر کی ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں پر ڈال دی۔ اقبال قمر اور سہیل ثاقب کو میں نے گھیر گھار کر شرکت کے لیے آمادہ کر لیا۔ لیکن حقیقی مضروب بٹ صاحب تھے۔ میں نے ان کے سامنے صرف ایک دلیل رکھی۔
''آپ کتاب کو دیکھیں نہ کہ صاحبِ کتاب کو۔''
بٹ صاحب نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔
خیر میں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اور چھوٹے چھوٹے واقعات بٹ صاحب کے بڑے کردار کے آئینہ دار ہیں۔
ان سے میرا تعلق نہ تو باقاعدہ رہا ہے اور نہ ہی پُرجوش۔ کبھی کبھار کسی مشاعرے میں اتفاق سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ لیکن اس تعلق کی گہرائی، گیرائی اور سچائی کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ بٹ صاحب مجھے ''تم'' کے صیغہ سے مخاطب کرتے تھے اور جب میں ان کے دورِ مجموعۂ کلام ''بدلتی رتوں کی حیرت'' کی پہلی کھیپ یہاں پہنچی تو اس میں سے ایک کاپ اڑانے والوں میں مابدولت کا نام بھی شامل تھا۔
ان کے مجموعۂ کلام کا ذکر آیا ہے تو مناسب ہوگا کہ ان کی غزل کے اجزائے ترکیبی میں سے ایک آدھ کی طرف اشارہ کرتا چلوں۔ یہ میرا منصب نہیں۔ آپ صرف سوت کی انٹی پر نظر رکھیں۔
نامور نقاد، ماہرِ اقبالیات، شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، ماہرِ تعلیم اور ''اصولِ تنقادِ ادبیات'' اور ''اسلوب'' جیسی شاہکار کتابوں کے مصنف پروفیسر سید عابد علی عابد دو جملے ملاحظہ ہوں:
''غزل میں یہی ایک وحدتِ تاثر ہوتی ہے جس کو بہت سے لوگ موڈ کے نام سے یاد کرتے ہیں یہ تاثر غزل کے ہر شعر میں رچا ہوتا ہے۔''
آگے لکھتے ہیں:
''یہ موڈ یا وحدتِ تاثر غزل کے تمام اشعار کو ایک لڑی میں پرو دیتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ شعروں کا اندرونی ربط ظاہراً معلوم نہ ہو یعنی اتنا کمزور اور اتنا لطیف ہو کہ اسے پہچاننے کے لیے ذہنی قوتیں کام میں لانا پڑیں لیکن جس بات پر مجھے اصرار ہے اور وہ بات میرے نزدیک غزل کا لازمی جزو ہے۔ وہ یہ ہے کہ چاہے یہ موڈ بالکل مدہم، بالکل کمزور

اور بالکل لطیف ہو کیوں نہ ہو اس کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ غزل، غزل نہ رہے گی بل کہ مختلف بستیوں کا مجموعہ بن جائے گی اور واقعتاً نیم وحشی نہیں بل کہ وحشی صنفِ سخن کا روپ دھار لے گی۔''

پروفیسر صاحب کے ان فرمودات کو سامنے رکھتے ہوئے بٹ صاحب کی کوئی سی بھی ایک غزل دیکھیے۔ مثال کے طور پر:

دوست، دشمن کو بتانا کہیں پڑ جاتا ہے
یوں بھی یہ رشتہ نبھانا کہیں پڑ جاتا ہے

کج تو ہم رکھتے ہیں دستار انا کو اپنی
کیا کہیں، سر کو جھکانا کہیں پڑ جاتا ہے

اپنے ماضی کا کوئی نقش سنبھالے رکھنا
کون تھے، کیا تھے، بتانا کہیں پڑ جاتا ہے

وہ تو ملنے کی بہت کرتا ہے کوشش ہم سے
راہ میں اس کی زمانہ کہیں پڑ جاتا ہے

کیا یہ لازم ہے کہ ہر بار ہدف بھی ہو کوئی
تیر بے سمت چلانا کہیں پڑ جاتا ہے

.....

کیا ضروری ہے کہ لو ہم سے ملاقات کا وقت
یارو! بے وقت بھی جانا کہیں پڑ سکتا ہے

اس غزل کی ایک تلاوت ہی اس کے داخلی آہنگ، وحدتِ تاثر یا موڈ کی مقناطیسی لہروں کو آپ کے ذوقِ سلیم کی سکرین پر نمایاں کرنے کے لیے کافی ہے۔ بعض افراد لفظوں کی نشست و برخواست یا بحر کے اتار چڑھاؤ کو غزل کا داخلی آہنگ سمجھنے لگتے ہیں ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ یہ ایک کیفیت ہے۔ بے شک غزل کے تمام اشعار مختلف موضوعات کے حامل ہوں۔ کیفیت ایک ہی رہے گی۔ یا ہوں سمجھیں کہ فریکونسی ایک رہے گی۔ ایسا نہیں کہ کسی شعر میں طوفان اُٹھ رہا ہے اور ساتھ والے شعر میں خاموشی ہے۔ کہیں بھنور اور کہیں روانی ہے۔

ذرا غور سے دیکھیں تو اس غزل کے تمام اشعار ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں سب کا لباس اور چال ڈھال ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے جذب کی جس کیفیت کی ابتدا غزل کے پہلے مصرع نے پیدا کی ہے۔ آخری مصرع تک برقرار ہے اور اسے اخذ کرنے کے لیے زیادہ ذہنی قوتیں صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ اس میں داخلی آہنگ یا وحدت تاثر مدہم، کمزور یا لطیف بالکل بھی نہیں۔ کسی بھی غزل کو کلاسیک کے مرتبے پر فائز کرنے کے لیے اس میں جہاں دوسرے اوصاف تلاش کرنے پڑتے ہیں کہاں اس خوبی کی موجودگی کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔

آدھی بات اور سن لیں۔

بنیادی طور پر ہر شعر چند کلمات کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے کچھ کلمات ایسے ہوتے ہیں جو شعر کی جان کہلاتے ہیں۔ ان کی جگہ کسی بھی دوسرے کلمے کو رکھیں گے تو شعر اپنی حیثیت کھو

بیٹھے گا۔ کیونکہ ہر کلمہ کی اپنی الگ شخصیت ہوتی ہے۔ جس کے ماتحت اس کا رنگ، دلکشی، دلبرائی، ناز اور دبدبہ وغیرہ متحرک ہوتے ہیں۔ بٹ صاحب ان کے انتخاب میں انتہائی محتاط ہیں۔ ان کی غزل کے کسی بھی شعر کا کوئی بھی لفظ بدلنے کی کوشش کریں تو مترادف نہیں ملے گا۔ صرف ایک مثال پیش ہے۔ مذکورہ بالا غزل کا تیسرا مصرع ہے:

کج تو ہم رکھتے ہیں دستارِ انا کو اپنی

.....

''کج تو'' کو ہٹا کر مصرع یوں بھی ہو سکتا ہے:

ٹیڑھی ہم رکھتے ہیں دستارِ انا کو اپنی

یا پھر

ترچھی ہم رکھتے ہیں دستارِ انا کو اپنی

.....

مصرع وزن میں تو پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن ''کج تو'' کے ساتھ بین السطور جس تکبر، نخوت اور غرور کا اظہار ہے ''ٹیڑھی'' لگانے سے وہ ناپید ہو جائے گا۔ اور ''ترچھی'' کلمہ بھی ان مفاہیم سے مزین نہیں ہل کہ یہ تو شوخی کا ترجمان ہے لہٰذا ''کج تو'' کی جگہ کوئی دوسرا کلمہ نہیں لے سکتا۔

تھوڑی دیر کے لیے اگر بٹ صاحب کی کتاب سے صرف نظر کیا جائے تو صرف اس ایک غزل کے محاسن پر مختلف حوالوں سے لمبی گفتگو کی جا سکتی ہے۔

میں جس دور میں وارد آیا منطقۂ شرقیہ میں ذکاء صدیقی کے شاگردوں کا طوطی بول رہا تھا۔ سہیل ثاقب، اقبال قمر اور طارق بٹ ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ میری اوقات جانچنے کے لیے سہیل ثاقب کے ہاں بظاہر ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ ان ارکانِ ثلاثہ کے علاوہ پینل میں محمود شاہد بھی بطور رکنِ چہارم موجود تھا۔ یہ سب کچھ بٹ صاحب کی چھپر چھایا میں ہوا۔ بہت ہی زبردست رنگا رنگ محفل تھی۔ اور بقول سہیل ثاقب میں ٹھہرا مولوی کا مولوی۔

سہیل ثاقب کے ہاں ہر ماہ باقاعدگی سے ادبی تقریب کا انعقاد ہوتا، جس میں کوئی ایک حرف دیا جاتا، جس پر جا کے قافیہ مکمل ہوتا۔ تمام شعرا اس حرف کی مناسبت سے اپنی غزل لاتے، جہاں مختلف بحروں کی گونا گونی ہوتی وہاں مختلف ردیفوں کی رنگا بھی بہار دکھاتی۔ میں اس وقت بھی زود گو تھا۔ آسانی سے بارہ تیرا شعار کہہ لیتا۔ ایک دن بٹ صاحب نے مجھے سمجھایا۔

''میاں! ساری غزل سنانے کے بجائے پانچ چھ اشعار سنایا کرو۔''

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ کچھ عرصہ بعد فرمایا۔

''پانچ چھ شعر تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے۔ پوری غزل سناؤ۔''

پھر ایک دن بٹ صاحب چلے گئے۔ فرید میسوری، شاہد محمود، ناز مظفر آبادی، شعیب نگرامی، اقبال قمر، سب چلے گئے سہیل ثاقب کی نہ ہلے کبھی کوئی خبر تھی نہ اب ہے۔ اکیلا رہ گیا ہوں۔ ایسا قحط الرجال کہیں کبھی نہیں دیکھا۔

☆☆☆☆☆

''میں کہانی میں لاپتہ ہوا تھا''

سلیم ساگر: جدید لب ولہجہ میں روایت کا پاسبان

سلیم ساگر عصرِ حاضر کے ان شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے روایتی مضامین کو جدید لب و لہجے کی تازگی عطا کی ہے۔ ان کا نیا شعری مجموعہ ''میں کہانی میں لاپتہ ہا تھا'' اُردو ادب کے افق پر ایک ایسی دستک ہے جسے مدتوں محسوس کیا جائے گا۔ اس کتاب میں روایت کا احترام بھی ہے اور جدیدیت کا شعور بھی۔ شاعر جہاں حمد و نعت میں روایتی عقیدت کا رنگ بھرتے ہیں، وہاں انسانی وجود کے بکھرنے کی داستان بھی سناتے ہیں۔ ان کے فن کا حسن یہ ہے کہ وہ قاری کو ماضی کی یادوں میں بھی رکھے ہیں اور حال کی تلخیوں سے بھی آگاہ کرتے ہیں اس کتاب کا عنوان ہی قاری کو ایک طلسماتی دنیا میں لے جاتا ہے، جہاں شاعر اپنی ذات اور کائنات کے درمیان گمشدہ کڑیوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ کتاب کا عنوان ''میں کہانی میں لاپتہ ہوا تھا'' بذاتِ خود وجودی تنہائی (Existential Loneliness) کی عکاسی کرتا ہے۔ آج کا انسان ہجوم میں رہتے ہوئے بھی خود کو اکیلا محسوس کرتا ہے۔ سلیم ساگر نے اس المیے کو بہت خوب صورت پیرائے میں بیان کیا ہے، جہاں مکان کی

محمد علی نجیب

وسعت انسان کے لیے قید بن جاتی ہے۔ اس کتاب کی شاعری محض الفاظ کا مجموعہ اور جذبات کا اظہار نہیں بل کہ فنِ سخن کی باریکیوں سے آگاہی کا نام اور تہذیبی شعور، داخلی کرب کا آئینہ ہے۔ ان کے کلام میں جہاں تصوف کی خوشبو ہے، وہیں اس میں عصری جیتے جاگتے مسائل کی کسک بھی موجود ہے۔ کتاب کی ابتدا حمد و نعت کے نورانی رنگوں سے ہوتی ہے، جو شاعر کی عقیدت اور روحانی وابستگی کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ شاعر نے مشکل پسندی کے بجائے سادگی کو اپنایا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ بڑی بات کو سادہ لفظوں میں کہنا ہی اصل کمال ہے۔ ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کا عجز اور انکسار پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی پہچان کو اپنی ذات کے بجائے پانی نسبوں میں تلاش کرتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ اپنے نام اور اپنی شناخت کی بات کرتے ہیں، تو ان کا قلم ادب و احترام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے:

میرے والد نے میرے نام سے قبل
آپؐ کا نام بھی لکھا ہوا تھا

.....

یہ شعر اس بات کی علامت ہے کہ شاعر کی جڑیں اپنی روایت اور دینی اقدار میں کتنی گہری ہیں۔ اسی طرح جب وہ حاضریِ درِ اقدس کا ذکر کرتے ہیں، تو ایک عجیب سا سکون ان کے اشعار میں اُتر آتا ہے:

اس نے در پر بلا لیا مجھ کو
جس کا مکے میں گھر بنا ہوا تھا

.....

سلیم ساگر کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی شعر فہمی ہے، جو ان کی شاعری کو محض جذبات کا مجموعہ نہیں رہنے دیتی بل کہ اسے ایک فکری جہت عطا کرتی ہے۔ ان کا مطالعہ اور روایت سے جڑا ہونا ان کے کلام کے ہر مصرعے سے جھلکتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ لفظ کو کہاں رکھنا ہے اور کس تراش خراش کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ وہ قاری کے شعور پر اثر کرے، مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

تو جو پلٹا اس کہانی میں
وقت آگے نکل چکا تھا

اور

وہ بھی وعدہ وفا کیا میں نے
جو کسی سے نہیں کیا ہوا تھا

.....

سلیم ساگر کی غزل میں محبت کا تصور بہت سادہ، سچا اور پُراثر ہے۔ وہ پیچیدہ استعاروں کے بجائے دل کی بات کو سہلِ ممتنع میں کہنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کے

ہاں محبوب کا تذکرہ کسی تخیلی پیکر کے بجائے ایک جیتے جاگتے احساس کی صورت میں ملتا ہے:

اس کی آنکھوں کا ایک دروازہ
میرے دل کی طرف کھلا ہوا تھا

.....

شاعر نے جدید علامتوں کے ذریعے انسانی نفسیات کی گرہیں کھولی ہیں۔ ان کے ہاں ''دروازہ''، ''دیوار''، ''تصویر'' اور ''کہانی'' محض الفاظ نہیں بل کہ استعارے ہیں۔ وہ جب کہتے ہیں:

گھر میں اتنی تصویریں تھیں
خود میں دیوار سے لگا ہوا تھا

.....

تو یہاں ''دیوار سے لگنا'' صرف جسمانی کیفیت نہیں بل کہ بے بسی، تنہائی اور اپنی ہی یادوں کے بوجھ تلے دب جانے کی علامت ہے۔ یہ شعر جدید انسان کی اس کیفیت کا عکاس ہے جہاں وہ یادوں اور مصنوعی دنیا کے درمیان اپنی اصل شناخت کھو دیتا ہے۔ یہ فنی پختگی ان کے کلام کو عامیانہ پن سے بچا کر اعلیٰ درجے کی شاعری بناتی ہے۔ شاعری میں اکثر یاسیت کا غلبہ ہوتا ہے، لیکن سلیم ساگر کا کمال یہ ہے کہ وہ ناکامیوں کے بعد ایک ایسے مقامِ تسلیم و رضا پر پہنچ جاتے ہیں جہاں امید اور آس سے بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے:

کتنے ناکام مرحلوں کے بعد
دل امیدوں سے ماورا ہوا تھا

.....

یہ ''امیدوں سے ماورا'' ہونا دراصل ایک صوفیانہ کیفیت ہے، جہاں انسان دنیاوی توقعات سے کٹ کر خالق کی رضا میں گم ہو جاتا ہے۔

''میں کہانی میں لاپتہ ہوا تھا'' سلیم ساگر کے پختہ شعری شعور کا دستاویزی ثبوت ہے۔ ان کے اشعار میں سادگی بھی ہے اور گہرائی بھی، جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ مجموعہ اُردو شاعری کے قارئین کے لیے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔

دعا ہے کہ سلیم ساگر کا یہ شعری سفر یونہی جاری و ساری رہے، ان کا قلم حق گوئی اور حُسنِ بیان کے نئے سنگِ میل عبور کرے اور ان کی یہ کتاب اردو ادب کے سنجیدہ حلقوں میں وہ مقام حاصل کرے، جس کی یہ حقدار ہے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

ناظم حسین کی نوآوستا

ناظم زرسنر کا اصل نام ناظم حسین ہے، مگر اس نے ''زرسنر'' کا ایسا تخلیقی تخلص اختیار کیا جس میں اس کی شعری شناخت اور لسانی دلچسپی دونوں سمٹ آئی ہیں۔

''زر'' اردو سے ماخوذ ہے، جو قیمتی، گراں اور نورانی جوہر کا اشارہ ہے۔

''سنر/Sinner'' انگریزی سے وابستہ ہے، جو انسانی کمزوریوں، خواہشات اور باطنی کشمکش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

یوں اس کا تخلص خود ایک علامت ہے — ایک ایسا انسان جو نور اور تاریکی، پاکیزگی اور خطا، روحانیت اور جسمانیت کے بیچ سفر کرتا ہے؛ اور یہی کشمکش اس کی نظموں میں ایک تہہ دار معنویت پیدا کرتی ہے۔

ناظم زرسنر کا پس منظر صرف تخلیق تک محدود نہیں بل کہ اس کی علمی وابستگی بھی اس کی شاعری میں جھلکتی ہے۔ وہ انگریزی زبان و ادب کا طالب علم ہے، اس لیے عالمی ادب، مابعد جدید تنقید، اور بین المتونیت کا شعور اس کے ہاں صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کی عروض پر گہری گرفت اسے ایک تکنیکی طور پر باصلاحیت شاعر بناتی ہے۔

ناظم زرسنر وہ نوجوان شاعر ہے جس نے کم عمری میں اپنی کثیر الجہتی سوچ اور جرات اظہار سے اُردو ادب کے سنجیدہ قارئین کو متوجہ کیا ہے۔

''نوآوستا'' نام ہی میں کچھ ایسی تازگی، تلاش اور دریافت کا احساس ہے جو ناظم زرسنر کے شعری مزاج کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ محض نظموں کا مجموعہ نہیں بل کہ ایک فکری سفر ہے جس میں شاعر نے مذہب، تاریخ، تہذیب، عشق اور جنس — ان تمام موضوعات کو نہایت مؤثر اور فنکارانہ انداز میں برتا ہے۔

ناظم زرسنر کی نظمیں محض جذباتی ردِعمل نہیں بل کہ تہذیبی حافظے کی گونج بھی رکھتی ہیں۔

محمد ندیم صادق

وہ مختلف تہذیبوں اور تاریخی تجربات کو اپنے بیانیے کا حصہ بناتے ہیں۔ ان کی نظموں میں کبھی قدیم اساطیر کا رنگ ملتا ہے، کبھی گم شدہ تمدنوں کا نوحہ، اور کبھی انسانی سفر کی لامتناہی جستجو۔

ان کے ہاں تاریخ جامد نہیں — ایک متحرک کردار ہے جو موجود کے ساتھ مکالمہ کرتی نظر آتی ہے۔

مذہب پر لکھتے ہوئے ناظم نہ داعظ بنتے ہیں، نہ منبر پر کھڑے خطیب۔ وہ مذہب کو انسان کی داخلی کائنات کے ایک استعارے کے طور پر برتتے ہیں۔ ان کی نظموں میں مذہب سوال بھی ہے، تلاش بھی، اور کبھی کبھی سکون کا ایک مختصر لمحہ بھی۔ یہ شعری رویہ انھیں دوسرے معاصر شاعروں سے ممتاز کرتا ہے۔

''نواوستا'' کی ایک خاص پہچان یہ بھی ہے کہ شاعر نے محبت اور جنس جیسے موضوعات کو نہ تو روایتی تقدس کے پردے میں چھپایا ہے اور نہ ہی سستی سنسنی کے لیے استعمال کیا ہے۔

ناظم کے ہاں یہ دونوں انسانی وجود کا لازمی حصہ ہیں — زندگی کے وہ رنگ جو انسان کو مکمل کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں محبت کبھی نرمی اور لطافت کی صورت میں اُبھرتی ہے، تو کبھی جسم اور روح کے پیچیدہ تعلق کے طور پر سامنے آتی ہے۔

ناظم زرسنر کی زبان سادہ بھی ہے اور تہہ دار بھی۔ وہ الفاظ کے ذریعے ایک ایسا صوتی اور معنوی توازن پیدا کرتے ہیں جو جدید نظم کی روح ہے۔ ان کی تراکیب میں تازگی ہے، تشبیہیں غیر روایتی ہیں اور استعارے ایک نئی معنویت لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان کی نظموں کا بیانیہ مکالماتی بھی ہے اور علامتی بھی، جس کی وجہ سے قاری ہر نظم میں اپنی ایک الگ قرأت تلاش کر سکتا ہے۔

''نواوستا'' نوجوان شاعری کا ایک معتبر اضافہ ہے۔ یہ مجموعہ نہ صرف ناظم زرسنر کی شعری پختگی کا ثبوت ہے بل کہ اردو ادب کے نئے رجحانات اور فکری امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو ایک طرف قاری کے ذہن کو چیلنج کرتی ہے اور دوسری طرف اس کے جمالیاتی ذوق کو بھی سیراب کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

سلمان یوسف سمیجہ کا بسایا گیا ''تتلی نگر''

وہ قلم کار قابلِ قدر و احترام ہیں جو کہانیاں لکھ کر کم سن قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کر رہے ہیں اور ان کو کتابوں سے قریب لا رہے ہیں۔ نوجوان سلمان یوسف سمیجہ بھی انھیں میں شامل ہیں۔

سلمان یوسف سمیجہ کا بسایا گیا ''تتلی نگر'' دل نشین کہانیوں کی تتلیوں سے آراستہ ہے۔

''تتلی نگر'' کی صورت میں تیسری کتاب آنے کا مطلب ہے کہ وہ بچوں کے ادیب کے طور پر خود کو منوا چکے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں جہاں بچوں کے اخلاق کی بہتری کی خواہش نظر آتی ہے، وہیں پیڑوں، پھولوں، جانوروں اور ماحول سے محبت کو بھی انھوں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کی کہانیوں میں تخلیقیت اور کہانی پن پوری طرح موجود ہے۔

بچوں کے مقبول ہفتہ وار صفحے ''کرنیں'' میں شائع شدہ ان کی کہانیاں قارئین نے بہت پسند کیں۔ ''مکپا چڑیا کا گھونسلا'' بہت اچھی کہانی ہے۔ ''گلاس میں کلاس'' انوکھی اور مزے دار کہانی ہے۔ ''ہانی مچھلی'' اور ''فروا اور سبزیاں'' کے اندر بھی کردار سازی کا سامان پایا جاتا ہے۔

اس کتاب میں شامل کہانیاں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ہمیشہ اپنی تخلیقات کو نئے موضوعات اور جداگانہ اسلوب سے سجاتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ اسی طرح خوب صورت اور دل چسپ کہانیاں لکھتے ہوئے اپنا قلمی سفر جاری رکھیں۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

محمد عثمان جامعی

''شریف ساجد کا جہانِ سخن''

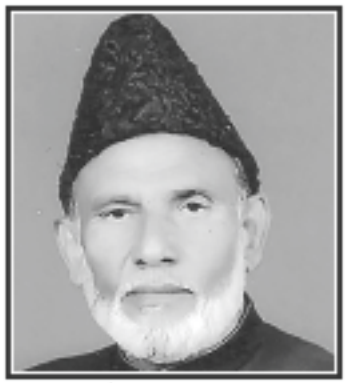

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کے شہر سے تعلق رکھنے والے شریف ساجد پاک پتن کے ممتاز اور استاذ الاساتذہ شاعر ہیں۔ آپ اُردو، پنجابی اور فارسی میں لکھتے ہیں۔ آپ پاک پتن کے علمی و ادبی حلقوں میں معتبر، ثقہ بند اور سربرآوردہ شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ نے پاک پتن کے ادبی منظر نامے پر ادب کے خزانے میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ شعری محاسن کے لوازمات کا عرفان، محاکاتی نظام اور شیریں بیانی کی دولت سے ثروت مند ہیں۔ جہاں ان کی مطبوعہ کتابوں سے ان کے تخلیقی شعور کا اندازہ ہوتا ہے وہیں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ آپ طرز اظہار کے حوالے سے انفرادیت کے حامل ہیں۔

شریف ساجد نے غزل، سہرا، نظم، نعتیہ قصیدہ نگاری، نعتیہ کلام، قطعہ تاریخ، رباعی، مناقب اہلِ بیت اطہار علیہم السلام اور مناقب بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ بھرپور ادبی فرزانگی و والہانہ محبت سے لکھے ہیں۔

معاملہ بندی اور واردات قلبی شریف ساجد کے ہاں زیادہ نکھر کر سامنے آئی ہے۔ کلام میں شوخی اور ایک خاص لطیف سا لطف محبوب کی چنچل ادائیں اور معشوقانہ انداز کی تصویریں جھلکتی دکھائی دیتی ہیں۔ نشاطیہ لہجہ میں محبوب کی اداؤں پر فدا اور ناز اداؤں پہ فریفتہ نظر آتے ہیں۔ حسن کی رعنائی و زیبائی و ہر جائی کے مضمون کو قرطاس پر سجا کر جذبوں کو دہکائے ہوئے ہیں۔ آپ کی غزل میں معاملات حسن و عشق ہی نہیں بل کہ

عباس علی شاہ ثاقب

حکمت و معرفت اور تصوف بھی ایک خاص انداز کے ساتھ فکری ارفعیت، ترفع خیال اور فلسفیانہ انداز میں وارد ہوئے ہیں۔ آپ نے تصوف کے متنازعہ اور گمراہ کن نظریات سے اپنے دامن کو بچا کر مصفّٰی، شفاف، حقیقت پسندانہ، منطقی اور فلسفیانہ انداز میں اپنے کلام کی زینت بنا کر تصوف جیسے موضوع کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ عارفانہ رنگ میں کیف و مستی اور جوش کے بجائے ہوش اور حقیقت و معرفت کے مضامین کا حسین امتزاج کسی محاکات نگاری اور مصوری کے کمالات کی طرح تصویر کشی سے عبارت محسوس ہوتا ہے۔

شریف ساجد کی شاعری حقیقت پسندی کا مرکب ہے ان کے کلام میں انفرادی رویوں کی تپش اور انفرادی تفکر و آلام کا نوحہ موجود ہے جس سے ادیب نے بے کس کی آواز بن کر اپنی انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی شاعری حقیقت نگاری سے بھی عبارت ہے۔ جب ان کی شاعری کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو حقیقت نگاری کا رنگ غالب نظر آتا ہے اسی حقیقت نگاری کی وجہ سے ہی ان کی شاعری میں معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں اور زندگی کی حقیقتوں کو سیدھے سادے الفاظ میں بے نقاب کرنے کی سعی اور کاوش نمایاں نظر آتی ہے۔

ان کے کلام میں متوسط طبقے کے روز و شب، امیرِ شہر کے استحصال کا تذکرہ اور غریبِ شہر کی زندگی کی تلخیوں کا مضمون بڑے دل دوز اور سوز دروں کی صورت میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ ادبی تخلیقات و سخن میں وہ کسی کا قد گھٹانے یا بڑھانے کے بجائے ادب کے گیسو سنوارتے نظر آتے ہیں۔ حضرت داغ دہلوی، باقر شاہجہان پوری اور کلاسیکی ادب کے پروردہ ہیں۔ نعت کے فروغ کی ادبی تنظیم ''اظہار نو'' کے تاحیات صدر ہیں۔ پاک پتن کی ادبی تنظیم ''ادب قبیلہ'' کے چیئرمین بھی ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مرکزی دفتر ادب قبیلہ پاک پتن کو ''شریف ساجد ہال'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں سربرآوردہ شخصیت ہونے کے باعث ان کے نام کا ادبی ایوارڈ ''شریف ساجد ادبی ایوارڈ'' کا اجرا بھی کیا گیا ہے۔ یہ اعزاز مختلف اصناف ادب میں خدمات انجام دینے والوں اور تخلیق کاروں کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر جاری کیا جاتا ہے۔

کلاسیکیت اور دہلوی لب و لہجے کے چہکتے ہوئے خوش نوا ادیب ہیں کیوں کہ اردو فقط زبان نہیں تہذیب بھی ہے تو آپ اس تہذیبی ورثے کو سنبھالے ہوئے ہیں جس کے ورثا اب کم کم رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ حضرت داغ دہلوی اور باقر شاہجہان پوری کے مسلک و مشرب کا اثاثہ

اور حوالہ ہیں۔

پاکستانی ادب کے فروغ میں ان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ پنجاب کی ادبی تاریخ میں مرکز سے دور چھوٹے شہروں کے جن اہل قلم کو اپنے بل بوتے پر روز و شب کی محنت اور ریاضت سے جو نمایاں مقام ملا ہے ان میں شریف ساجد کا نام ممتاز مقام رکھتا ہے۔ پاک پتن کی سرزمین بڑی زرخیز ہے کیوں کہ یہاں صوفی شاعر بابا فرید الدین مسعود گنج شکر اور پنجابی کے شیکسپیئر حضرت بابا وارث شاہ جیسے سدا بہار تخلیق کار پیدا ہوئے۔

جس طرح سے شریف ساجد نے نئے تخلیق کاروں کی تربیت و اصلاح کا کام کیا ہے اس سے محسوس یہی ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ پاک پتن کو علم و ادب میں باوقار مقام دلا کر رہیں گے۔

جس انداز سے ادب کے فروغ میں سرپرستی اور اپنا کردار ادا کیا ہے اس سے پاک پتن کے ادبی منظر نامہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

انھوں نے خود کو صرف اور صرف ادب کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ عمر کے اس حصے میں بھی میدانِ عمل میں سرگرم ہیں، ادب سے ان کی والہانہ دل چسپی قابل دید و قابل داد ہے۔ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے ہیں تعلیم اور علم دوستی ان کی شخصیت کا خاصا ہے۔ آپ محض تخلیق کار ہی نہیں بل کہ ادیب گر بھی ہیں آپ کے تلامذہ کی بڑی تعداد پاک پتن کی ادبی روایت کا اثاثہ ہے۔ یہی خوبی آپ کو ممتاز کرتی ہے اور استاذ الاساتذہ کے درجے پر فائز کرتی ہے۔ انھیں سب سے زیادہ جو چیز پسند ہے وہ کتاب ہے۔ ان کی شخصیت میں ٹھہراؤ اور متانت ہے جس سے ان کی شخصیت بہ ظاہر یک رنگ دکھائی دیتی ہے مگر آپ کی تخلیقات کے صد ہا رنگ اور ہزار ہا پہلو ہیں۔ آپ کا جہانِ سخن اور رنگِ فکر کیا ہے؟ گویا قوسِ قزح و دل خوش کن اور آنکھوں کو خیرہ کرتی ادبی کرنیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔

کسی شخص کو سمجھنا دراصل اس کی ذات کی پرتوں اور سطحوں کے گورکھ دھندے میں الجھنے کے مترادف ہے۔

ایک تخلیق کار جو ادبی خدمات کے جذبے سے متصف ہو اس کی قلمی مشقت کو پذیرائی نہ دینا جس کا وہ مستحق ہو ادبی بددیانتی ہے۔ شریف ساجد کی ادب سے وابستگی نصف صدی پر محیط ہے۔

اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے وہ پاک پتن کی پہچان بن چکے ہیں۔

انھوں نے اپنی روح کا سارا کرب و اضطراب اور بے قراری کا درد شعروں میں سمو دیا ہے۔ مزاحمتی شاعری اور محنت کش و پسے ہوئے طبقے کی نمائندگی ان کے کلام کا خاصا ہے۔ ان کے اشعار محض عمدہ مضمون سے عبارت ہی نہیں ہوتے بل کہ جذبات کے اظہار کے لیے خوب صورت لفظوں اور دل نشین

تشبیہات و استعارات سے ان کے ہاں نئی نئی راہیں تراشیدہ ملتی ہیں۔ غم چشیدہ اور عشق گزیدہ اپنے احساسات و محسوسات اور جذبات و تجربات جب قرطاس کے سپرد کرتا ہے تو پھر پتھروں کو تراش کر نگینہ بنا دیتا ہے۔ یہ سفر صرف ذات تک محدود نہیں رہتا بل کہ یہ سفر شعور، تحت شعور اور لاشعور کا بھی ہوتا ہے، جو ظاہر و باطن کے آموزش اور آمیزش سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں تحیر، تغیر، جستجو، خوش بُو اور خواب و خیال کی دنیائیں آباد ہیں۔ شاعری کے لیے جن خوبیوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کے کلام اور فن میں بہ خوبی پائی جاتی ہیں۔ ان کے قارئین ہل چل اور کش مکش سے آشنا ہو جاتے ہیں۔

امکان و بعید از امکان، بدلتے حالات کے ساتھ تبدیل ہوتے رہے اور اظہار کے لیے نئے نئے انداز اپنائے گئے ہیں۔ ان کے ہاں مقصدی کلام، اصلاحی موضوعات، حقیقت نگاری، واقعہ نگاری اور رومانیت و علامت نگاری کے آب شاریں جھرتی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے انسانی زندگی کے نشیب و فراز، تیرگی و روشن امکانات، رشک و رجا، حسد و عناد، الفت و وابستگی و خود سپردگی، سماجی و اجتماعی اندیشوں، مرئی و غیر مرئی قوتوں اور نادیدہ کرداروں کو جذب و کیف اور تحفظ و عدم تحفظ کے جذبات کے تحت قرطاس کے سپرد کیا ہے۔ ''چاند کسے دیکھتا رہا'' میں لطیف پیرائے محبت، گلاب اور چنبیلی کی عطر بیز خوشبو، جواں جذبوں کے کھلتے خیالوں کی بھینی بھینی مہک میں یہ سوچنا کہ چاند کسے دیکھتا رہا ایک الگ جہاں کی اختراع ہے۔ چاند جو خود خوب صورتی کی علامت ہے اس کا بھی کسی کو دیکھنا شریف ساجد کی شعری معنویت کو چار چاند لگا تا محسوس ہوتا ہے۔ علامت نگاری نے ان کے کلام کو جدیدیت کے ہم پلہ کر دیا ہے۔ ''سنگ ریزوں میں شجر'' کا اسلوب اور انداز بھی کسی امید افزا اور ارتقا کا پیغام لیے منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہے۔ ان کے انداز بیان میں تحرک، تجدید، امید اور جذباتیت غالب ہے۔ ان کے ہاں الفاظ و تراکیب میں جذبات کی فراوانی اور بندش کی چستی نے زبان کو خوب صورتی اور تازگی سے مزین کر دیا ہے۔ کسی تمثیل نگار کی طرح لفظوں کی ادائیگی سے کرداروں کا عکسی شعور ان کی شعری کرافٹ کا ثبوت ہے۔ ''سنگریزوں میں شجر'' کا نمو پانا زندگی کے گہرے مفہوم کا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ ''کلیاتِ شریف ساجد'' میں دل کش انداز میں شعر کہنے کا سلیقہ جلوہ گر ہے جو ان کے فکری وفنی اور تکنیکی انداز کے مقام و مرتبہ کو بلند کرتا ہے۔ آپ پر بی ایس اور ایم فل سطح کے مقالے بھی لکھے جا چکے ہیں۔ آپ جہانِ سخن کے وہ طوطیِ خوش مقال ہیں جن کے حسنِ جمال سے غزل میں معاملہ بندی کی

رعنائی و رنگِ حنائی کی زیبائی جلوہ ریز ہے۔ شعور و وجدان اور مشاہدے کے لفظی روپ نے مبالغے کی جگہ حقیقت نگاری اور مرصع سازی کی جگہ سادگی و پرکاری نے لے لی ہے۔ جذبے کے خلوص نے مضامین کو لفظی پیکر میں ڈھل جانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ان کے حمدیہ کلام میں تہلیل و تسبیح کی گہری رغبت کا رجحان، زوردار تکبیر کی گھن گرج اور تحمید کا ذوق و شوق بڑی سعادت مندی سے پایا گیا ہے۔ نعتیہ کلام لکھتے وقت شریف ساجد بہ خوبی جانتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات، خاتم النبیین کی محبت و مودت، عقیدت مندی، خصائص و کمالات، جمالات اور سیرت مصطفیٰ کے مبارک گوشے بڑی نزاکتوں سے قرطاس کے سپرد کرتے ہیں۔ عملی اطاعت رسول کا ابلاغ اور سیرت مصطفیٰ کی اتباع کی رغبت دلانا ان کا منہج ہے۔ ''لفظ لفظ نعت'' میں سیرت مصطفیٰ کے تاباں جلوے تخلیقی توانائی اور داخلی واردات سے پیش کیے گئے ہیں۔

قرآنی تلمیحات، تاریخی استعارات، ندرت افکار اور تازگیِ اظہار کو جذبہ عشق کی تیز آنچ سے کندن بنایا گیا ہے۔ پُرامن معاشرے کے قیام میں ادب اور ادیب کا بلاشبہ تاریخ ساز حصہ رہا ہے۔ فکری انقلاب کی بہ دولت ٹھہرے ہوئے پانیوں میں تحرک اور روانی پیدا ہوتی ہے۔ لطیف جذبوں میں گہرے سماجی شعور کے کینوس متاثر کن ہیں۔

ہر تخلیق کار اپنے دائرہ کار میں سوچتا اور اپنی فکر کو آراستہ و پیراستہ کرتا ہے۔ یہی معاملہ شریف ساجد کے ساتھ ہے کہ وہ اپنے ہم عصر اہل قلم میں منفرد نظر آتے ہیں۔ شعر و ادب کے لیے لازم ہے کہ اس کے تقاضوں اور علم پر عبور حاصل ہو یہی وصف انھیں علمی و ادبی حلقوں میں ممتاز کرتا ہے۔ آپ صرف ذہنی ارتقا کے مراحل سے آشنا ہی نہیں بل کہ اس کے ارتقائی سلسلے کے پیچ و خم سے بھی واقف ہیں۔ پاک پتن کے ادبی منظر نامے کی جب بھی بات ہوگی شریف ساجد کے بغیر مکمل نہیں ہوگی آپ نے معاصر شعری منظر نامے کے قصرِ عظیم الشان کی تعمیر و تشکیل میں شعرا کے فنی کمالات و فکری ارتقا، تخلیقی سنگ و خشت کا کام بھی دیا ہے۔ شریف ساجد کی شاعری فکری تنوع، فنی بوقلمونیوں اور لازوال تخلیقی و اختراعی قوتوں کے وصف خاص کی بہ دولت اہمیت کی حامل ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی مشاہدے کی قوت ہے۔

دوران مطالعہ ان کے فکری ارتقاء کے کشف منکشف ہوئے۔ ابتدا سے کلیات کی تکمیل تک جس ذوق و شوق اور تلاش و جستجو سے کام لیا گیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ زود گوئی، غیر محسوس انداز میں لفظوں کی بُنت کاری، عمدہ ڈکشن اور زیر لب مسکراہٹ پُر کیف ہے۔ ایسے تخلیق کار پاکستانی اُردو ادب کا اثاثہ اور پہچان ہیں۔

☆☆☆☆☆

زندگی کا مقصد

کچھ خیالات ذہن کو پریشان کرتے ہیں سکون چرا لیتے ہیں جتنا ان پہ غور کریں اتنی بے چینی ہوتی ہے یہ اپنے ساتھ بہت سے سوالات لاتے ہیں اور سمجھ نہیں آتی ان کے جوابات کیسے دیں حالانکہ جواب آسان اور سامنے ہوتا ہے۔

ایک سوگوار شام کو بوجھل دل لیے میں اپنے چھوٹے کمرے کی کھڑکی کے ساتھ سٹول پر بیٹھا ہوں میری پشت دیوار کے ساتھ لگی ہے میں میدان میں تیز برستی بارش دیکھ رہا ہوں بارش سے بوجھل تیز ہوا کا جھونکا پرانے birch کے پیڑ کے سکوت کو جھنجھوڑتا ہے یہ وقت تو جھٹپٹے کا ہے سورج یوں بھی غروب ہو رہا ہی بادل سیاہ ہیں بجلی چلی گئی ہے کمرے میں تاریکی ہے میرے سامنے چھوٹی میز پر ایک موم بتی رکھی ہے جس کا شعلہ بجھنے والا ہے میں بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں اپنا چہرہ رکھے اور کھڑکی میں کہنی ٹکائے باہر دیکھ رہا ہوں سوچ رہا ہوں سوچے چلا جاتا ہوں یہ باہر پرانے درخت مجھے کیا محسوس کراتے ہیں یہ آنسو بہاتا آسمان کیا سوچیں پیدا کرتا ہے اور کمرے کی تاریکی میرے دل کی جگہ کیسے گھیرتی ہے میرے دل کو کیا بے قراری ہے میں سوچتا ہوں'' کیا مقصد ہے ان سب کا؟ ان میں سے ہر شے کا؟ کیا مقصد ہے سڑکوں پر چلنے کا؟ ہر روز ایک سے لوگوں سے ملنے کا؟ اپنے والدین سے فون پر بات کرنے کا جو میری سالگرہ پر بھی بمشکل ظاہر ہوتے ہیں کیا وہ کاموں میں مصروف ہیں جبکہ میں اکیلا رہتا۔ ہوں کام تو میرے بھی ہیں زندگی کا اور کاموں کا کیا مقصد ہے؟''

میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں میرے ہونٹ کپکپانے لگتے ہیں میں سرد آہ بھرتا ہوں میں پھر سے سوچنے لگتا، ہوں ہم کیوں روزمرہ کی ایکٹیوٹیز میں حصہ لیتے رہتے ہیں کہیں باہر جانے سے پہلے ہم اس کی فکر کیوں کرتے ہیں کہ ہم کیسے لگ رہے ہیں جو ہم سے توقع کی جاتی ہے ہم وہ ہی کیوں کرتے ہیں۔ یہ معاشرہ 'رواجات' تہذیبیں، ذمہ داریاں، توقعات، احتساب اور باہمی تعلقات کیا ہیں؟ یہ سسٹم کا دہراو ان سب کا حاصل پوائنٹ کیا ہے؟

میری کھڑکی بارش سے گیلی ہو رہی ہے اور شیشے دھندلے ہو رہے ہیں شیشے کے پار کا منظر دھندلا رہا ہے میں بس یونہی یہاں بیٹھا ہوں شام اتنی گہری ہو چکی کہ باہر کی

محمد علی راحیل خان

چیزوں کی شناخت بمشکل ہو پا رہی کسی چیز کا کوئی مطلب نہیں جیسے زندگی کا کوئی مطلب نہیں میں کسی خاص وجہ کے بغیر کھڑکی کے شیشے پر ہاتھ پھیرتا ہوں دھندلاہٹ کا ایک ٹکڑا صاف ہو گیا ہے میں ادھر ادھر ہاتھ پھیر کر مزید دھندلاہٹ دور کرتا ہوں اب کھڑکی صاف ہے میدان کے بائیں کونے میں ایک بڑے درخت میں مجھے متحرک چڑیا دکھائی دیتی ہے وہ گھونسلے میں متحرک ہے اپنے پروں سے اپنے انڈے ڈھانپ رہی ہے ہلتی شاخوں پر اس کا گھونسلا غیر یقینی کیفیت میں ہے پر وہ ایسے کوشاں ہے جیسے وہ ہی تو اسے سنبھالے ہوئے ہے پھر میرا خیال وہاں سے ہٹ گیا۔

باڑ کے پیچھے ایک کتے پر اچانک نگاہ پڑی جو مٹی کے پیالے سے پانی پی رہا تھا جو مالی نے وہاں رکھا ہوا تھا وہ پانی اتنے اشتیاق سے پی رہا تھا جیسے بہت پیاسا ہو پھر پر مسرت انداز میں دم ہلائی اور چلا گیا پھر میری نگاہ سرخ گلابوں کی کیاری پر پڑی یہ کیاریاں سوکھی پڑی تھیں پیچھے ہونے کے سبب ان کی اتنی دیکھ بھال نہیں ہوتی تھی مگر بارش نے ان کیاریوں کو سیراب کر دیا اچانک موم بتی بجھ گی کمرے میں اندھیرا ہو گیا تاہم اتنی روشنی تھی کہ گرد و نواح کا پتا چلتا تھا اس لیے میں نے دوسری موم بتی کامیابی سے نکالی۔

''چک''۔۔ میں نے نئی موم بتی روشن کر دی اس کا نیا نویلا شعلہ چمک رہا تھا۔

میں نے مڑ کر کھڑکی کو دیکھا وہ پھر سے دھندلا گی تھی میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے صاف کیا پھر اپنے گیلے ہاتھوں کو دیکھا اور سوچا اگر یہ ہاتھ نہ ہوتے میں سادہ سا کام بھی نہ کر سکتا یہ ہاتھ کیسی جادوگری رکھتے ہیں جب خوش ہوتا ہوں یہ تالی بجاتے ہیں جب اداس ہوتا ہوں میرے آنسو پونچھتے ہیں میری روزمرہ زندگی میں مدد کرتے ہیں میرا بھاری بیگ اٹھاتے ہیں میں مسکرا پڑا ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے ہر لمحے کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے چڑیا کا انڈوں کو ڈھانپنا انڈوں سے بچوں کے نکلنے کا انتظار کرنا چڑیا مقصد رکھتی ہے بارش مقصد رکھتی ہے کتے کی پیاس بجھانا سبزے کو زندہ کرنا کتے نے جس مٹی کے پیالے میں پانی پیا وہ پیالہ مقصد رکھتا ہے ورنہ کتا زمین سے پانی نہیں چاٹ سکتا تھا۔

چڑیا بارش بادل مٹی کا پیالہ گلاب کی کیاریاں سب با مقصد ہیں ہم ہمیشہ ایک مقصد رکھتے ہیں مگر ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اب میں مطمئن ہوں مجھے جواب مل گیا ہے بارش والی اتوار مجھے بھلی لگنے لگی ہے میں جانتا ہوں زندگی آسان نہیں مگر میں اپنے ہونے کے مقصد کو گلے لگاتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

''تصور میں مدینہ ہے'' [تصور اقبال]

تصور اقبال عہدِ حاضر کے اُن صاحبِ اعتبار شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کے ہاں عقیدتِ رسولِ کریم ایک مستقل روحانی کیفیت کی صورت میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان کا نعتیہ مجموعہ تصور میں مدینہ ہے اسی وارفتگیِ محبت اور والہانہ وابستگی کا مظہر ہے۔ اس مجموعے کی شاعری پڑھتے ہوئے یہ احساس نمایاں ہوتا ہے کہ شاعر نے محض لفظوں کی آرائش پر اکتفا نہیں کیا بل کہ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی عقیدت کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ نعت گوئی ایک ایسا مقدس اور محتاط میدان ہے جس میں قدم رکھنے کے لیے ادب بارگاہ رسالت اور باطنی طہارت درکار ہوتی ہے، اور تصور اقبال کی شاعری اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ وہ اس روایت کے امین شاعر ہیں۔ چند امثال اشعار:

یوں تو موجود ہے ہر جگہ وہ سدا
اس کو دیکھا نہیں پر کسی نے کبھی --

ملتی ہے نصیبوں سے جس جس نے کبھی مانگی
لایا ہوں میں جھولی میں خیرات مدینے کی

یوں تو افضل ہے ذکرِ خدا مرحبا
پر خدا کو بھی پیارا ہے ذکرِ نبی

اس کی قسمت یقیناً ہے رشکِ قمر
جس کا روضے کے نزدیک گھر بار ہو

.....

''تصور میں مدینہ ہے'' کے اشعار میں مدینہ منورہ کی محبت، حضورؐ اکرم کی ذاتِ اقدس سے قلبی وابستگی اور درود و سلام کی روحانی فضا پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ شاعر کے ہاں عقیدت کا اظہار نہایت سادہ، دلنشیں اور پُر اثر اسلوب میں سامنے آتا ہے، جس کے باعث قاری نہ صرف شعری لطف سے آشنا ہوتا ہے بل کہ ایک روحانی سرشاری بھی محسوس کرتا ہے۔

رانا خالد محمود قیصر

یوں یہ مجموعہ محض نعتیہ کلام کا مجموعہ نہیں بل کہ عشقِ رسولؐ کی خوشبو سے مہکتا ہوا ایک ایسا روحانی گلشن ہے جس میں داخل ہونے والا قاری بھی عقیدت و محبت کی اسی فضا میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

تصور اقبال کی نعتیہ شاعری میں مدینہ منورہ کی حاضری کی تمنا ایک گہری روحانی آرزو کی صورت میں نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کلام میں بار بار یہ احساس ابھرتا ہے کہ شاعر کے دل کی اصل طلب شہرِ طیبہ کی حاضری ہے۔ وہ مدینہ کی گلیوں میں پھرنے، اس بابرکت سرزمین کی خاک کو عقیدت سے بوسہ دینے اور اسی خاک کو آنکھوں کا سرمہ بنانے کو سعادت سمجھتے ہیں۔ تاہم ان کے ہاں اس آرزو کا دائرہ صرف زیارت تک محدود نہیں رہتا بل کہ وہ شہرِ طیبہ میں قیام کو اصل نعمت تصور کرتے ہیں، جہاں رحمتوں کی چھاؤں اور اہلِ کرم کی قربت میسر آتی ہے۔ یوں تصور اقبال کی شاعری میں مدینہ کی محبت محض ایک جذباتی خواہش نہیں بل کہ ایک ایسی روحانی وابستگی کے طور پر جلوہ گر ہوتی ہے جو شاعر کے فکر و احساس کو مسلسل منور رکھتی ہے۔

تصور اقبال کی ادبی خدمات مختلف موضوعات اور فکری جہات پر مشتمل ہیں۔ ان کی تصانیف ''گلاب بصد آب۔ تصورِ حرا۔ نور کے تصور میں۔، ہاتھ میں جلتا دیپ، محبت زندگی ہے، اداس کیوں ہو'' اور بالخصوص ''تصور میں مدینہ ہے'' ان کی فکری و تخلیقی جہتوں کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کتب کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تصور اقبال کے ہاں محبت، روحانیت اور عقیدت بنیادی محرکات کی حیثیت رکھتے ہیں، جنھیں انھوں نے اپنے منفرد اسلوب میں شعری پیکر عطا کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''تصور میں مدینہ ہے'' دراصل اسی فکری سفر کا نقطۂ عروج معلوم ہوتی ہے، جہاں شاعر کی عقیدتِ رسولؐ اپنے پورے اخلاص اور والہانہ جذبے کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس مجموعے میں مدینۂ منورہ کی محبت، حاضری کی تمنا اور بارگاہ رسالت سے قلبی وابستگی نہایت مؤثر انداز میں ظاہر ہوئی ہے۔ یوں یہ کتاب نہ صرف تصور اقبال کی نعتیہ شاعری کا خوب صورت اظہار ہے بلکہ ان کے باطنی احساسات اور روحانی وابستگی کا آئینہ بھی ہے، جو قارئین کے دلوں میں محبتِ رسولؐ کی خوشبو بکھیرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

کمرۂ جماعت: جہاں اونگھتے ہوئے مستقبل کی پرورش ہوتی ہے (ایک انشائیہ)

عمار نعیمی

دنیا میں عجیب و غریب مقامات کی کمی نہیں لیکن انسانی تاریخ کی سب سے پُراسرار، متضاد اور دل چسپ جگہ اگر کوئی ہے تو وہ ''کلاس روم'' ہے۔ بہ ظاہر یہ چار دیواروں، ایک چھت اور چند کھڑکیوں پر مشتمل ایک کمرہ ہوتا ہے لیکن اس کے اندر جو ''کیمسٹری'' جنم لیتی ہے اس کا فارمولا آج تک کوئی سائنس دان دریافت نہیں کر سکا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں انسان کو پہلی بار یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ آزادی ایک عارضی نعمت ہے اور اصل زندگی گھنٹی کی آواز کے تابع ہے۔

کلاس روم میں داخل ہوتے ہی وقت کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت اگر کہیں عملی طور پر سمجھنا ہو تو بورنگ لیکچر کے دوران گھڑی کی سوئیوں کو دیکھ لیں۔ وہ سوئیاں جو بریک کے دوران خرگوش کی طرح بھاگتی ہیں کلاس روم میں داخل ہوتے ہی کچھوے کی رفتار اختیار کر لیتی ہیں۔ مجھے اکثر لگتا ہے کہ کلاس روم کی دیواروں میں کوئی ایسا مقناطیس چھپا ہوتا ہے جو پلکوں کو بھاری کر دیتا ہے۔ دنیا کی بہترین نیند کسی مخمل کے گدے پر نہیں بل کہ کلاس روم کی سخت لکڑی کی کرسی پر استاد کے لیکچر کے دوران آتی ہے۔ یہ وہ مراقبہ ہے جس میں طالب علم آنکھیں کھلی رکھ کر سونے کا فن سیکھتا ہے اور یہ فن اسے مستقبل میں سرکاری ملازمت کے دوران بہت کام آتا ہے۔

کلاس روم کا جغرافیہ بھی بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ یہ کمرہ نہیں بل کہ ایک چھوٹا سا ملک ہوتا ہے جس کے اپنے صوبے اور علاقے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ''اگلی نشستیں'' آتی ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں ''نور'' برستا ہے۔ یہاں بیٹھنے والے طلبہ بظاہر انسان لگتے ہیں مگر دراصل یہ فرشتے ہوتے ہیں یا پھر استاد کے خفیہ ایجنٹ۔ یہ استاد کے ہر جملے پر ایسے سر ہلاتے ہیں جیسے انھیں کائنات کے سارے سربستہ راز سمجھ آ گئے ہوں۔ ان کا قلم ہمیشہ حرکت میں اور گردن ہمیشہ اثبات میں رہتی ہے۔ یہ کلاس کا وہ طبقہ ہے جس سے باقی تمام کلاس شدید حسد اور نفرت کا ایک ملا جلا جذبہ رکھتی ہے۔

اس کے بعد ''درمیانی نشستیں'' آتی ہیں۔ یہ وہ ''عوام'' ہیں جو نہ ادھر کے ہیں نہ ادھر کے۔ یہ بیچارے صرف ڈگری لینے آئے ہوتے ہیں۔ یہ استاد سے ڈرتے بھی ہیں اور پچھلی سیٹوں والوں کی شرارتوں پر ہنستے بھی ہیں۔ یہ کلاس کا ''مڈل کلاس'' طبقہ ہے جو

دونوں طرف کے دباؤ میں پستا رہتا ہے۔
اور پھر... پھر وہ مقدس علاقہ آتا ہے جسے ''بیک بینچرز'' کی سلطنت کہا جاتا ہے۔ کلاس روم کا اصل حسن اور رونق یہیں ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں مستقبل کے بڑے بڑے سیاست دان، فلسفی اور انقلابی تیار ہوتے ہیں۔ یہاں بیٹھنے والوں کا نصابی کتابوں سے تعلق برائے نام ہوتا ہے لیکن زندگی کے حقائق پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ پچھلی نشستوں پر بیٹھ کر ہی طالب علم یہ عظیم فن سیکھتا ہے کہ ''کچھ نہ کرتے ہوئے بھی بہت مصروف کیسے نظر آنا ہے''۔ یہاں لنچ باکس ٹائم سے پہلے کھل جاتے ہیں اور استاد کی نظر بچا کر نوالہ منہ تک لے جانے کا جوائے و نچر یہاں ہوتا ہے وہ کسی سنسنی خیز فلم میں بھی نہیں ملتا۔ اگر کلاس روم ایک جسم ہے تو فرنٹ بینچرز اس کا دماغ ہیں اور بیک بینچرز اس کا دل۔ دماغ سوچتا رہتا ہے لیکن دل دھڑکتا ہے اور زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے۔
کلاس روم کی ایک اور اہم ترین چیز ''بلیک بورڈ'' (یا وائٹ/گرین بورڈ) ہے۔ یہ وہ سکرین ہے جہاں علم کا ڈراما چلتا ہے۔ استاد اس پر جو کچھ لکھتا ہے وہ طالب علموں کے لیے ''نقشِ دیوار'' کم اور ''نقشِ برآب'' زیادہ ہوتا ہے۔ ادھر لکھا ادھر مٹایا۔ مجھے ہمیشہ بلیک بورڈ دیکھ کر انسانی یادداشت کی بے ثباتی کا خیال آتا ہے۔ کتنا علم ہے جو چاک کی دھول بن کر فضا میں بکھر جاتا ہے اور طالب علموں کے پھیپھڑوں میں جم جاتا ہے۔ شاید اسی لیے پرانے زمانے کے لوگ کہتے تھے کہ علم ''سینے'' میں ہوتا ہے کیوں کہ چاک کی گرد واقعی سینے میں ہی جاتی تھی۔
کلاس روم میں ایک کھڑکی کا ہونا لازمی ہے۔ یہ کھڑکی طالب علم کے لیے ''فرار کا راستہ'' ہوتی ہے۔ جب اندر ماحول گرم اور بورنگ ہو جائے تو یہ کھڑکی باہر کی دنیا کا منظر پیش کرتی ہے۔ ایک طالب علم کے لیے الجبرا کی مشکل مساوات سے زیادہ دلچسپ وہ کوا ہوتا ہے جو باہر درخت کی شاخ پر بیٹھا ''کائیں کائیں'' کر رہا ہو۔ وہ کوا آزاد ہے اور طالب علم قید۔ اس کھڑکی سے آنے والی ہوا کا جھونکا آزادی کا پیغام لاتا ہے۔ جو طالب علم کھڑکی سے باہر ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہو اسے کبھی نالائق نہ سمجھیں وہ دراصل اس وقت فلسفیانہ موڈ میں ہے اور کائنات کے اسرار و رموز پر غور کر رہا ہے (یا شاید یہ سوچ رہا ہے کہ چھٹی میں کتنی دیر باقی ہے)۔
اور پھر وہ آواز... وہ گھنٹی (Bell) کی آواز! دنیا کی کوئی موسیقی، کوئی سمفنی اس آواز کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو آخری پیریڈ کے ختم ہونے پر بجتی ہے۔ یہ آواز صورِ اسرافیل کی طرح ہوتی ہے جس کے بجتے ہی مردہ جسموں میں جان پڑ جاتی ہے۔ کتابیں بند ہونے کی آوازیں، بستوں کی زپیں بند ہونے کا شور اور کرسیوں کے گھسٹنے کی آواز... یہ ایک ایسا آرکسٹرا ہے جو صرف کلاس روم میں ہی سنا جا سکتا ہے۔ وہ استاد جو ابھی تک دیو ملائی دیو لگ رہا تھا اچانک

ایک عام انسان نظر آنے لگتا ہے کیونکہ اس کا اختیار ختم ہو چکا ہوتا ہے۔

لیکن کلاس روم صرف دیواروں اور فرنیچر کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا سانچہ ہے جو ہمیں معاشرے میں فٹ ہونے کے لیے تیار کرتا ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ کیسے ناپسندیدہ لوگوں (ہم جماعتوں) کے ساتھ بھی گزارا کرنا ہے

کیسے بوریت کو برداشت کرنا ہے اور کیسے اپنی باری کا انتظار کرنا ہے۔ ہم وہاں صرف فزکس یا مطالعہ پاکستان نہیں سیکھتے ہم وہاں ''منافقت'' اور ''مصلحت'' کا پہلا سبق بھی پڑھتے ہیں کہ جب استاد ڈانٹ رہا ہو تو چہرے پر ندامت کیسے لانی ہے چاہے دل میں ہنسی کا فوارہ ہی کیوں نہ پھوٹ رہا ہو۔

آج جب ہم عملی زندگی میں ہیں تو وہ کلاس روم بہت یاد آتا ہے۔ وہ جگہ جسے ہم ''قید خانہ'' سمجھتے تھے دراصل وہی تو ''آزاد زندگی'' تھی۔ وہاں کی فکریں کتنی چھوٹی تھیں۔ ہوم ورک نہ کرنے کا ڈر، ٹیسٹ میں فیل ہونے کا خوف یا قلم گم ہو جانے کا دکھ۔

باہر کی دنیا میں آ کر پتہ چلا کہ اصل امتحان تو کلاس روم کے باہر ہوتے ہیں جہاں کوئی نصاب نہیں ہوتا اور کوئی ''ری ٹیک'' (Retake) کا موقع نہیں ملتا۔

کلاس روم خالی ہو جائے تو اس کی خاموشی بڑی پراسرار ہوتی ہے۔ کبھی چھٹی کے بعد خالی کلاس روم میں جا کر دیکھیں وہاں بینچوں پر لکھی ہوئی تحریریں، دیواروں پر لگے سیاہی کے نشان اور فضا میں بسی ہوئی ایک خاص مہک آپ سے باتیں کرتی ہے۔ وہ خالی کمرہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہوتا ہے کہ ''یہاں زندگی گزری ہے۔''

انسان پوری زندگی کلاس روم سے نکلنے کی جدوجہد کرتا ہے، ڈگریاں لیتا ہے، دروازے توڑ کر باہر بھاگتا ہے لیکن جب وہ باہر کی کھلی ہوا میں سانس لیتا ہے اور زندگی کی دھوپ اسے جھلساتی ہے تو وہ پلٹ کر اسی بند کمرے اسی سخت بینچ اور اسی بورنگ لیکچر کو ترسنے لگتا ہے۔

کیا یہ عجیب بات نہیں؟

ہمیں لگتا تھا کہ ہم کلاس روم میں ''وقت'' کاٹ رہے ہیں جبکہ درحقیقت کلاس روم ہمارا ''وقت'' محفوظ کر رہا تھا۔ وہ دیواریں قید خانہ نہیں تھیں وہ تو سیپیاں تھیں جنہوں نے ہمارے بچپن اور لڑکپن کے موتیوں کو سنبھال رکھا تھا۔

اب جب کبھی کسی اسکول کے پاس سے گزرتے ہوئے گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے تو قدم بے اختیار رک جاتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ کوئی ''لیٹ پاس'' (Late Pass) بنا دے اور اجازت دے دے کہ جاؤ پچھلے بینچ پر جا کر بیٹھ جاؤ اپنا لنچ باکس کھولو اور دنیا کو بھول جاؤ۔

مگر افسوس! زندگی کی کلاس میں ''بیک بینچ'' نہیں ہوتے یہاں سب کو فرنٹ لائن پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔

☆☆☆☆☆

جام درکؒ کے لیے

ساربان آسماں دیکھ کر تھم گئے
پاؤں ناقاؤں کے ریت میں جم گئے

اونٹ بٹھلائے ، محمل اتارے گئے
میخیں گاڑیں ، پڑاؤ اسارے گئے

وہ ، طناب اطاق محبت کھنچی
اک بنائے رواق محبت کھنچی

زندگی دشت میں خیمہ زن ہو گئی
لوگ مل بیٹھے ، غربت وطن ہو گئی

داستاں گو ، الاؤ بنانے لگے
ساز کے تار ، مطرب ، ملانے لگے

تار و مضراب کے رابطے جم گئے
آگ سلگی ، پروں کے پرے جم گئے

چنگ ، آہنگ کا ہم نوا ہو گیا
قافلہ ، محو کار غنا ہو گیا

اہل دل ذکر کا لطف لینے لگے
سم دکھانے لگے ، تال دینے لگے

رات بھر ، ساربانوں کے نغمے سنے
عشق آساں زمانوں کے نغمے سنے

سوز سامان جلوہ نما ہو گئے
اہل غم ، محو رقص ہوا ہو گئے

رات کے گال پر چاند سا خال تھا
ہالہء ماہ اک ماہ نو سال تھا

انگ ، نو سال کے رقص کرنے لگے
آتشیں زمزمے رقص کرنے لگے

دھڑکنیں ، جانجھنیں جھنجھنانے لگیں
خون میں خواہشیں سرسرانے لگیں

گوشہء گوش میں گنگناتی رہیں
نقرئی بالیاں جھلملاتی رہیں

چشم زن ، اس گھڑی عرش پر چاند تھا
رقص زن جس گھڑی فرش پر چاند تھا

ایڑھ پا کر ، ہواؤں کو چھونے لگیں
خواہشیں ، انتہاؤں کو چھونے لگیں

آنکھیں جلنے لگیں ، تن تپکنے لگا
اور نس نس لہو سر پٹکنے لگا

جسم جھلسا گئی ، روح سلگا گئی
وہ نظر آگ تھی ، ہڈیاں کھا گئی

کچھ ہواؤں نے بھی ہم سے دھوکا کیا
تن بدن اس کی خوشبو میں نہلا دیا

تن میں، دل کی دھمک حشر ڈھانے لگی
موج خوں، روح تک سنسنانے لگی

وہ نظر، وہ مہک، اک ادا ہو گئی
وہ گھڑی ایک پل میں ہوا ہو گئی

موج خوں ٹھوکریں مار کر رہ گئی
اور یہ مار بھی چشم تر سہہ گئی

لوگ خوشبو کے پیچھے لپکتے رہے
چشم نم، اپنی دھن میں مہکتے رہے

عمر بھر اک الاؤ سا جلتا رہا
عشق بھی، ایک قصہ تھا چلتا رہا

بکلیں مار لیں، آگ تاپا کیے
رات جنگل کی تھی، رات ماپا کیے

اے ازل! اے ابد! داد گر، داد رس!
رب اہل رضا!، رب فریاد رس!

ایک جلتی جدائی کے رقبے میں ہیں
ہم بھی تیری محبت کے رستے میں ہیں

تودۂ خاک تھے، خاک پا ہو گئے
ایک ٹھوکر میں ہم، کیا سے کیا ہو گئے

زر زباں ہو گئی، زر تبر ہو گیا
شہر کا شہر زیر و زبر ہو گیا

سر بلندی بھی اب سر بلندی نہیں
سر اُٹھانا، کہیں عقل مندی نہیں

گاؤں، موج غزالان وحشت زدہ
شہر، انبوہ ترکان دہشت زدہ

اے خداوند! اے داد گر، داد رس!
رب اہل رضا، رب امداد رس!

خودستائی بھی سچائی لگنے لگی
بات، بن بات، دانائی لگنے لگی

بات نغمہ سرائی کی حد میں نہیں
پارسائی، رسائی کی حد میں نہیں

کار غم، کار شیرازہ بندی نہیں
کار نوحہ گری، درد مندی نہیں

آنسوؤں کی جگہ، لوگ آنکھوں میں ہیں
ہم بھی تیرہ دلوں کی نگاہوں میں ہیں

لوگ چلتے رہیں، یار جلتے رہیں
ہم بھی روشن انہی گھپ اندھیروں میں ہیں

راستہ چھوڑ کر راستہ دے دیا
بات کو موڑ ہم نے نیا دے دیا

رب اہل رضا!، داد گر ، داد رس!
رب فریاد رس!، رب امداد رس!

جب دلوں کی لویں کپکپانے لگیں
صبح کے خوف سے ڈگمگانے لگیں

زندگی ، رت جگا ، ہم کو لگنے لگے
چہرہ ، جلتا دیا ہم کو لگنے لگے

تن میں دل کی دھمک حشر ڈھانے لگے
موت رگ رگ میں جب سرسرانے لگے

لفظ جذبوں کی خوشبو چرانے لگیں
رنگ ، چہروں کی زردی اڑانے لگیں

اے ازل ، اے ابد! داد گر، داد رس!
رب اہل رضا!، رب فریاد رس

کوئی ہنگام ہو ، ایسا جادو نہ ہو
زر زباں ہو تو ہو ، زور بازو نہ ہو

زندگی کا الاؤ بھی جلتا رہے
عشق بھی ایک قصہ ہے چلتا رہے

انگلیاں ، محو کار غنائی رہیں
اہل دل ، محو کار حنائی رہیں

داد گر ، داد رس ، رب فریاد رس
رب اہل رضا ، رب امداد رس

اک کہانی تبر ، تیر ، افسانہ ہے
زر ، فقط زر نہیں ، اسلحہ خانہ ہے

آج پھر رحم کر ، اک تن آسان پر
بہر حب نبی ، راہ آسان

اک گل اندام کے قاصدوں کی جگہ
تیرے عشاق کے حاسدوں کی جگہ

تیرے عشاق ہوں، تیرے مشتاق ہوں
لوگ بے باک ہوں، درد بے باق ہوں

ہم نجوم مہ شاہ لولاک ہوں
پابہ گل ہوں ،مگر سر، در افلاک ہوں

اے خدا جام کا عشق پھر عام ہو
عشق ، بندوں کا بندہ ہو، بن دام ہو

رب اہل رضا! رب فریاد رس!
داد گر! داد رس! ، رب امداد رس!

ہم تن آسان ہیں ، فقر سامان کر
بہر حب نبیؐ ، راہ آسان کر

بہر حب نبیؐ ، راہ آسان کر
بہر حب نبیؐ ، راہ آسان کر

خالد احمد

بحران

نہ دردِ حرمتِ انساں
نہ فردِ حرف و بیاں
کھلا کہ شانِ ترقی ہے
حرب کا ساماں

اور اب ہے فیصلہ
بپھرے بموں کے ہاتھوں میں
وغا میں مارے گئے
آشتی کے سب امکاں

لباسِ کہنہ جو ڈسنے لگا
تن و جاں کو
تو پوری کینچلی اپنی
بدل رہا ہے جہاں

اِسی طرح سے جو
بارود بارشوں میں رہی
زمین ساری کی ساری
کرے گی کل بھاں بھاں

جو بولنا ہے تجھے
خوب ناپ تول کے بول
کھلائے گل نہ کوئی پھر
تری سیاہ زباں

طویل تر ہوئی جاتی ہے
اپنی تیرہ شبی
نہ کوئی چاند فلک پر
نہ کوکبِ تاباں

مرض بڑھاتے چلے جا رہے ہو
جس صورت
کسی کے پاس رہے گا نہ
درد کا درماں

وہ آج کیسے
حقیقت میں ڈھل رہا ہے دیکھ
کہ جس کو تو بھی سمجھتا تھا
محض میرا گماں

جلیل عالی

پتوار سلامت ہے

مشکل ہے کہ دوری کا آزار سلامت ہے
سر پھوڑ چکے پھر بھی دیوار سلامت ہے

برباد ہوا چاہے سکھ چین ہزاروں کا
کیا فکر تجھے تیرا پندار سلامت ہے

ناچیز سہی لیکن تجھ کو بھی خبر ہو گی
ہم ہی سے محبت کا معیار سلامت ہے

کوشش رہی پیوستہ قصہ ہی مٹا ڈالیں
کر شکر اگر کوئی کردار سلامت ہے

اعلان جنوں کا ہے اکثر تیرے ہونٹوں پر
ہر چند گریباں کا ہر تار سلامت ہے

خوش فہم نہ ہو اتنا اک سنگ کے ہٹنے سے
مت بھول کہ رستے میں کہسار سلامت ہے

دیکھو زرہ گلیوں میں گن شوخی طفلاں کے
اس شہر میں اب کس کی دستار سلامت ہے

گلزار ہمیں دیکھو کشتی کو ڈبو کر بھی
کس فخر سے کہتے ہیں پتوار سلامت ہے

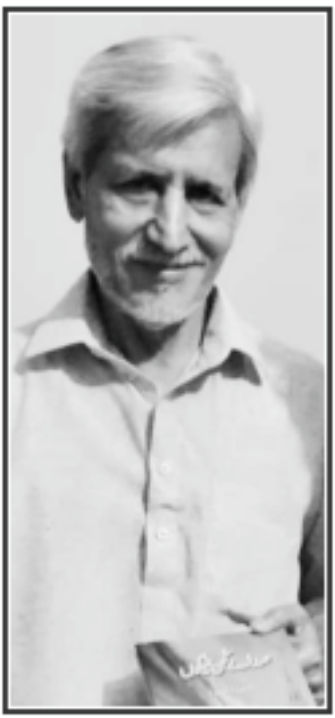

گلزار بخاری

سماعت کا مقدر

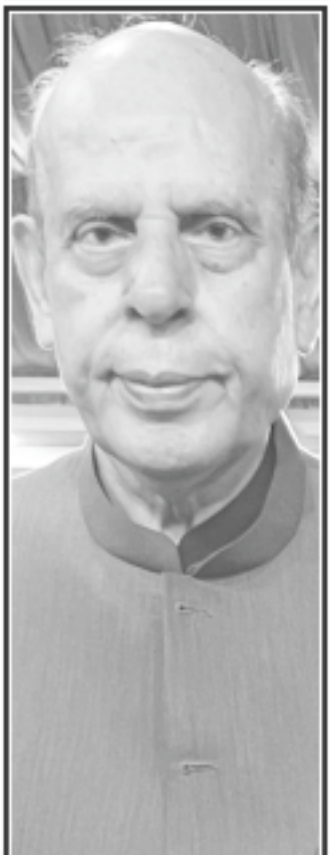

سید افسر ساجد

وداعِ شام سے پہلے
فقط اک بے نشاں سورج کی گرد آمیز زردی کو
بکھرتا دیکھنے کی خواہش بے نام تھی دل میں

سو ہم بیٹھے رہے یوں ہی
وداعِ شام سے پہلے
مگر سورج کی یہ کرنیں
سراب آگہی کے بے کراں ساحل کی اندھی
اور جھلستی ریت کے ویران منظر پر
وصالِ شب کی یخ بستہ بشارت کا نوشتہ تھیں

ہمارے آنگنوں کی بے چراغی پر
فلک کی آنکھ سے آنسو نہیں ٹپکا
کسی منزل کے رستے پر
کوئی آہٹ نہیں جاگی
کوئی نغمہ نہیں پھوٹا
صدائے گریہ و ماتم
سماعت کا مُقدر ہے!

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

محیطِ حلقۂ آزار دیکھ لیتے ہیں
ہم اپنا دائرۂ کار دیکھ لیتے ہیں

ہوا دستکیں دے رہی ہے

ہَوا دستکیں دے رہی ہے
ذرا بڑھ کے دروازہ کھولو
موسمِ حبس رخصت ہُوا
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل پڑی
ہر کلی کِھل اُٹھی
زندگی کِھل اُٹھی

O

کیا عجب بات ہے
کیا عجب رات ہے
آج تارے زمیں پر اُترتے چلے جا رہے ہیں
دُوریوں کے سبھی زخم بھرتے چلے جا رہے ہیں
روشنی اِس قدر بڑھ گئی ہے
قربتیں جگمگانے لگی ہیں
رہروانِ محبت کو،
جیون کا رستہ دکھانے لگی ہیں

O

انیسِ دل و جاں!
یہی ہے وہ اِک ساعتِ جاوداں
جس کے دامن میں،
راحت ہے،
چاہت ہے

چلو آؤ دونوں!
اِسی ساعتِ جاوداں میں
نئی رہگزارِ محبت پہ پہلا قدم ثبت کر دیں
دیارِ تمنا، گلابوں سے بھر دیں

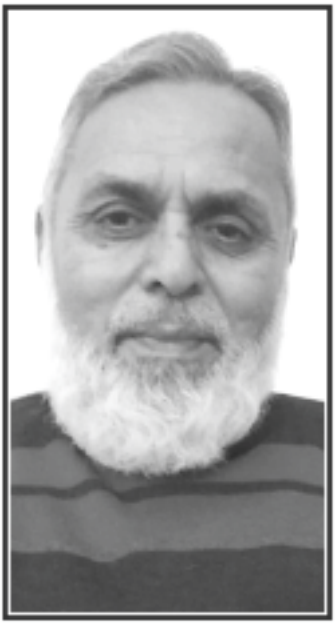

محمد انیس انصاری

بات

آج سمجھ میں آئی بات
گہری چپ ہے، گہری بات

رنگ ہے اک آوازہ ، اور
خوشبو دھیمی دھیمی بات

کھل کر بات نہیں کرتا
دل ہے اور ، عبوری بات

سانس میں بھرتا سناٹا
اور ہوا میں گھلتی بات

ایک ادھورا سپنا ہے
لب پر ایک ادھوری بات

اک دن چپ کے سناٹے
دھڑکی دل میں سوئی بات

سینے سے اک ہوک اٹھی
اور آنکھوں میں سلگی بات

آنچل میں بھر لائی رت
کون سمے کی بھیگی بات

پات گرے ، تب چونکی ڈال
دل میں رہ گئی دل کی بات

ڈال ہری، تو بھاگ بھری
سوکھی اور ، سمے کی بات

دھیرے دھیرے جھڑتے پات
مٹی ، مٹی ، ہوتی بات

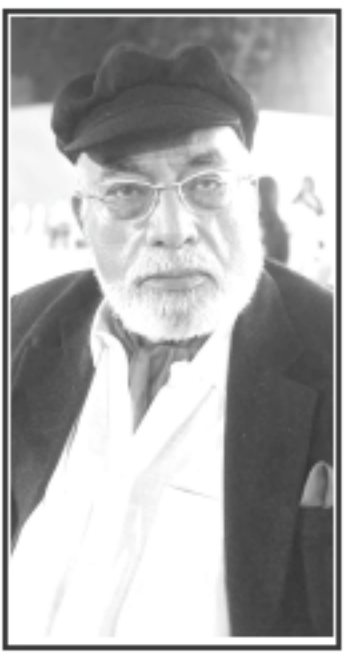

طارق بٹ

بیٹیاں

بیٹیوں کے ہیں دکھ انوکھے سے
درد رُکتا نہیں ہے روکے سے
مجھ کو بٹیا کا دھوکا ہوتا ہے
چاند تکتا ہے جب جھروکے سے
بیٹیوں کے ہیں دکھ نرالے سے
دل سنبھلتا نہیں سنبھالے سے
روز بٹیا کا حال پوچھتا ہوں
چاند سے چاندنی کے ہالے سے
بیٹیوں کے دم سے ہے گھر میں بہار
خوشیوں کے مکھڑے پہ ہے ان سے نکھار
مختصر یہ بات کرتا ہوں جلیل
بیٹیاں ہیں رحمتِ پروردگار

احمد جلیل

آنسوؤں کی دیا سلائی

عجب گھٹن ہے
فضا میں گہرا دُھواں دُھواں ہے
شکستہ پائی کے، نارسائی کے
یہ تیری سانسوں میں چبھنے والے
اُسی دُہائی کے اشک ہیں یہ
قطار اندر قطار آنکھوں سے بہنے والے،
جو بے بسی سے گزر گئی ہے
جو ساحلوں پر کھڑے جہازوں کو دیکھتے ہی
جو ریل کی پٹڑیوں پہ سیٹی کی کُوک سن کر
روانگی کے لیے ہے تیار اب فلائٹ
یہ دھیما اعلان سُنتے کانوں
کنارِ دریا کہیں بہت دور جاتی ناؤ کو ڈولتا
جب بھی آنکھ دیکھے
تو آنکھ کی سیڑھیوں سے اتریں قطار اندر
قطار چہرے پہ بہنے والے
شکستہ پائی کے، دل سے اٹھتی ہوئی دُہائی
کے اشک ہیں یہ!
زمین پر چوکڑی جمائے
یوں سر جھکائے بہار ہے ہو
ادھر تو دیکھو!

ہوا بہت تیز چل رہی ہے
مسلسل اک آگ سی تمھارے بدن کے
اندر بھی جل رہی ہے
اسے بجھاؤ!
اس آگ و اپنے آنسوؤں کی دیا سلائی تو مت دکھاؤ!
کچھ اور لمحے گزر گئے تو کچھ اور بھڑکے گا
یہ الاؤ، اسے بجھاؤ!
اس آتشِ درد کا کھولتا یہ پانی تمھارے
رُخ پر بنا رہا ہے
جو گہرا گھاؤ، اسے مٹاؤ!
مجھے بتاؤ یہ اشک اس درجہ زرد کیوں ہیں؟
تمھارے ہاتھ اتنے سرد کیوں ہیں؟
مجھے خبر ہے کہ یہ جدائی کے اشک ہیں یہ،
شکستہ پائی کے، نارسائی کے
دل سے اُٹھتی ہوئی دُہائی کے اشک ہیں یہ!
زمین پر چوکڑی جمائے
یوں سر جھکائے بہار ہے ہو

رخشندہ نوید

میں ماضی ہو جاتا ہوں

طلعت شبیر

گاؤں کی فضاؤں میں تیرتی خاموشی
دِل کے تار چھیڑتی ہے
سوندھی مٹی میں بسی خوشبو
سانسوں میں اُترتی ہے
سورج کی آخری کرنیں پیڑوں سے چھن کر آتی ہیں
تو شام کے سائے پھیلتے چلے جاتے ہیں
سُرمئی شام میں یادیں قطار در قطار لپکتی ہیں
کبھی کبھی سرِ شام ہجر کے دُکھ
شکستہ حال مسافر کی طرح لوٹ آتے ہیں
پھر کوئی مانوس سی آوازوں کی سرگم
دِل کو چھو جانے والے پُرانے گیتوں کی
مدھرتان میں ڈھل جاتی ہے
پھر ایک آواز ہے جو رات کی خاموشی میں
غبارِ یاس سے اُبھرتی ہے
ایک مانوس سی آواز
جو مہ و سال کی قید سے آزاد
دِل کے آنگن پر دستک دیتی چلی جاتی ہے
تو میں تادیر
حال سے ماورا
کسی بھولے بسرے وقت کا
قیدی ہو جاتا ہوں
میں ماضی ہو جاتا ہوں

بانسریاں بیچنے والے

نگران
کیدو
بانسری کا دشمن ہے

وہ
درختوں سے خائف رہتے ہیں

وہ
گھروں باغوں سڑے کنارے لگے
اشجار سے ڈرتے ہیں
اُن کو اب ہر جگہ رُکھ نظر آنے لگے ہیں
جن پر پچھل پیریاں اور عفریت رہتے ہیں

گم شدہ
ہیلوسینیشن کے شکار
Psychiatric Hospital
کے باہر بانسری بجانے والے سے
اپنے گھروں کا پتہ پوچھ رہے ہیں

خواجہ خورشید انور کی دُھن
"او ونجھلی والڑیا
توں تاں موہ لئی او مٹیار
او نیناں والڑیے
نی میری ونجھلی دی توں ایں تان"
سے دھیدو اور ہیر سلیٹی تک پہنچنے میں
اُن کو کتنے یُگ بیت چکے ہیں
اس کا اندازہ کون کرے

وہ
بانسریاں بیچتے
سمے کے ہاتھوں
خود بک چکے ہیں

تنویر قاضی

گم گشتہ

کہیں وہ وقت رکھا ہے
جہاں تم تھے
جہاں میں تھا
مگر اب ہم نہیں ہیں
اگر ہیں تو!
کسی چائے کی پیالی میں
کہیں اک ڈائری میں
کہیں سوکھے ہوئے پھولوں
کی مانند
مردہ بٹوے میں
کسی خوشبو کی صورت
مر چکے ہیں
کوٹ کالر میں
گلی کے موڑ پر
دروازے کی دستک،
کہیں خاموشیوں کی گرد میں
لپٹے پڑے ہیں

کہیں الماریوں کی شیلف پر
دیمک زدہ روتی کتابوں میں
کہیں گم گشتہ نیندوں میں
پڑے ان مردہ خوابوں میں
کہیں تو وقت رکھا ہے

سمیع اللہ عرفی

”جنگ“

وقت کے حاکمو---
تم کو معلوم ہے----
تیر و تلوار سے یہ مسائل کی گتھی سلجھتی نہیں
پھر یہ جنگ و جدل----
ڈھیر بارود کے---- کس لیے
دونوں جانب سے چلتی ہوئی گولیاں ---
بم دھماکے--- نہیں دیکھتے----
سامنے کون ہے
پل کے پل میں اُجڑ جاتی ہیں بستیاں---
راکھ میں کتنے کڑیل جوانوں کے ملتے
ہیں بس چیتھڑے---
سُرخ جوڑے کو خوابوں میں تکتی ہوئی لڑکیاں
کب نہا جائیں گی خون میں کیا خبر
اپنے کاندھوں پہ غربت کو لادے ہوئے
زندگی جن کو پہلے بھی اک بوجھ ہو
کیا کریں----
کتنی معصوم، ننھی سی وہ کونپلیں---
پھول بن کے مہکنا تھا چاروں طرف
جو تمہاری اناؤں پہ واری گئیں
جرم کوئی نہیں تھا مگر بے خطا
ایک اندھے دھماکے میں ماری گئیں
وقت کی ریت مٹھی میں ٹکتی نہیں
اس تباہی کو مل بیٹھ کر روک لو
اژدہا جو ہے پالا ہوا ایٹمی
اس سے پہلے نگل جائے سارا جہاں
وقت کے حاکمو----
ہوش سے کام لو،----

ارشد محمود ارشد

جارحیت کے سورنگ [نثری نظم]

جارحیت
ظلم کی کلر فوٹو کاپی ہے
انسانی تاریخ
قابیل سے ہابیل تک
مسلسل
تشکیک کے آسیب میں مبتلا ہے
کیسے سفید خون
فولادی اعصاب کو شل کر دیتا ہے؟
بزدلی
نارنجی جیکٹ اتار کر
انقلابی نعروں کا چوغہ پہن لیتی ہے
بے حسی
لال طوفان کی سرخی لیے
سبز موسم کو نیلا کر دیتی ہے
آسمانی فضا میں
فٹ بال کی طرح چیخیں اُبھرتی ہیں
جب کہ
طاقت کے زہریلے مادے
سمندر کی سبھی لہروں کو
زیر و زبر کرتے ہوئے
موت کو
انسانی لقموں میں بانٹ دیتے ہیں
معاشرے میں جنگ
کبھی فلاح کی ضمانت نہیں ہوتی
محض قبروں کے کتبوں میں
اضافے کا سبب ہے
ہم کس طرح
تہذیبی اقدار سے دور
بدحالی کے سوکھے پتوں پر بیٹھ کر
تاریخ کے اوراق
سیاہ کر رہے ہیں
جب کہ
سفید دن کی روشنی
ہمارے جرائم کی داستاں پر
ہنستی ہے

امجد بابر

ڈھلتی عمر کا فلرٹ

منظر اعجاز

مَیں باغ، جس پر بہار تھی تو، پر اسکی شدت گزر چکی تھی۔
وہ چاند اپنے عروج سے تھوڑا ڈھل گیا تھا
سیاہ راتیں سفید کرنے کی استطاعت مگر وہی تھی۔
تعارفی ابتدائیے سے ذرا سا آگے
وہ ہنس کے بولی
''میں بیس برسوں سے اس ادارے میں منتظم ہوں--''
میں ایک حیرت سے (مصنوعی حیرت سے) چونک اٹھا
''یہ کیسے ممکن ہے--؟؟
آپ بچپن سے ہی یہاں پر---؟؟''
(اور آدھے جملے میں بات پوری بنائی میں نے)
ہنسی چمکنے لگی لبوں پر---
بہت سے لوگوں سے سُن چکی تھی وہ ایسی باتیں
بہت سے چہروں سے کہہ نہ پایا تھا مَیں یہ جملے
خجل ہُوا تو کتاب مَیں نے یہاں سے لے کر
وہاں پہ رکھ دی
معاف کیجیے--- وہ مسکرائی اور آگے چل دی۔

آیت اللہ سید علی خامنہ ای کی نذر

روشن تھی ترے رخ پہ دمک شیر خدا کی
آنکھوں میں فروزاں تھی چمک شیر خدا کی

اک دھیمی سی آواز میں تھا رعب غضب کا
لہجے سے چھلکتی تھی کھنک شیر خدا کی

اک چہرے پہ جلوہ تھا حسین اور حسن کا
اک نطق میں اتری تھی جھلک شیر خدا کی

اک نام میں شامل تھا حسین اور علی بھی
جملوں سے چھلکتی تھی رمک شیر خدا کی

اس چہرے پہ کچھ خوف کے آثار نہیں تھے
اس دل کو میسر تھی کمک شیر خدا کی

دشمن پہ میزائل کی وہ برسات ہوئی ہے
آفاق پہ چھائی ہے دھنک شیر خدا کی

پھر دیکھ کے تنہا سر میدان حسینی
نم آج ہوئی ہو گی پلک شیر خدا کی

ملوایا گیا ہو گا حسین اور حسن سے
جنت میں ملی ہو گی تھپک شیر خدا کی

مرحب کے عزیزوں کی یہی موت ہے سرور
دیکھی ہے انھوں نے جو لپک شیر خدا کی

سرور حسین نقشبندی

خواب کب جرم بنے؟

محبت کو سمجھنا اتنا آساں ہے کیا
اسے ہم نے لفظوں میں قید کیا
اور بھول گئے کہ یہ زخم ہے

محبت کا چراغ جلے
تو روشنی، نہ جلے تو اندھیرا

دو لفظ
کبھی زندگی بدل دیتے ہیں
اور کبھی ان کی خاموشی
سب کچھ چھین لیتی ہے

یہ لمحے
اب وقت کی دسترس میں نہیں
چاروں سمت راستے نہیں
کانٹے ہیں

قدم رکھو، تو لہو
ہاتھ بڑھاؤ، تو زخم

کون صحیح، کون غلط
یہ سوال اب بے معنی سا لگتا ہے

اصل سوال یہ ہے کہ
خواب آخر، کب جرم بنے؟

ہر تعبیر ایک نیا راستہ
اور ہر راستہ ایک نئی قیمت مانگتا ہے

فرہاد کا تیشہ پہاڑ سے زیادہ
انسان کو کاٹ گیا

اور یہ جا بجا بکھری لاشیں
کیا تمہارے ضمیر کو جھنجھوڑتی نہیں؟

محبت اور امن
کسی خواب کا نام نہیں

یہ وہ چراغ ہیں
جو خونِ جگر سے
جلتے ہیں

شبیر آکاش

''قدیمی چاہتوں کے دکھ''

تنہائی اور خامشی نے گھر میں یوں نقب لگائی ہے کہ
خود سے ملنا بھی مشکل لگتا ہے

نادیدہ اوہام ہر پل پیچھا کرتے ہیں
اب تو دیواروں سے باتیں کرتے کرتے
من اوبھنے لگا ہے
کل شب سحری کا تارا بھی
چھت پر نہیں آیا
دھند کی اوٹ سے اندھا سورج گھر کا رستہ
ڈھونڈ رہا ہے
ہر چہرے پر خوف رقصاں ہے
سفر تو کوئی بھی آسان نہیں ہوتا
لیکن ہجرت کے زخم کبھی نہیں بھر پاتے
پرانے رستے لاکھ بھلائیں
پیچھا کرتے ہیں

آدھی رات کے سپنے اکثر سچ نہیں ہوتے
لاشعور میں بسنے والی خواہشوں کا شائبہ بن کر
یادوں کی صورت سپنوں میں ڈھل کر نیند کی
آنکھوں میں رہنے آجاتے ہیں
سچ ہے کہ
قدیمی چاہتوں کے زخم کبھی نہیں بھرتے
کوئی بھی موسم ہو
ہرے رہتے ہیں

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی کی دلدلوں میں زندگی دھنس جائے گی
شہر مٹی کے سمندر میں اسارے جائیں گے

دفن کر دینا

ٹکٹیں کنفرم اپنی ''لندن'' کی

وقت ''پرواز'' کا بھی ہونے کو

''بیوی بچے'' ہیں بیٹھے گاڑی میں

جانے کی بھی جنہیں بہت ''جلدی''

''دامنِ وقت'' میں نہ گنجائش

جلد ، ''میّت وصول'' ، کر لیجو

''باپ'' میرے کو''دفن''، کر دینا

فون کرتے ہوئے بخاری جی

ایک ''بیٹے'' نے بولا ''ایدھی'' کو

عاصم بخاری

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

عکس بھی سایہ بھی ضیا بھی نہ تھا
جس کو چھونے کا حوصلہ بھی نہ تھا

استغاثہ

زن میں پھر بہرِ دغا دشمنِ غاصب آیا
یا نبیؐ! دل مرا فریاد کی جانب آیا

مَیں گریزاں رہا مظلوم کی نصرت سے سوا ب
دستِ ظالم مری دستار کی جانب آیا

نرغۂ کفر میں پھر سے تری اُمّت آئی
اور کوئی دم کہ عدو وہم پہ بھی غالب آیا

دیکھ کر ملّتِ بیضا کی شکستہ حالی
استغاثہ مرے اظہار پہ واجب آیا

زور ہے بازوِ حیدر کا اُسے قائم رکھ
یا نبیؐ! پیشِ عدو تیرا محارب آیا

پاسبانی ہوئی تفویض حرم کی جس کو
یا نبیؐ! بن کے وہ باطل کا مصاحب آیا

جنید نسیم سیٹھی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے ماحیِٔ غمِ دل و دنیا! ترے لیے
محوِ دعا رہے رسلِ ذوالمنن تمام

ترسیل جاری ہے (نثری نظم)

محمد عبداللہ

بالکنی سے اُترا
اشتہام فروش
ہاتھوں میں رنگ برنگے نقش کا
نقرئی پلندہ
دستخط شدہ سیدھا سادہ
بڑی سہولت سے
گاہکوں کا نام پڑھتا
ہوا میں اُچھالتا
آگے بڑھ رہا ہے
کسی گم نام جزیرے کی خواب گاہ،
رتجگے کی کسی جگ مگاتی محفل،
کسی میز کرسی پہ رکھے اَدھ کھلے بریف کیس
سے جھانکتے
شراکت داری، خرید و فروخت
کے معاہدوں
یا پرنٹ شدہ باتصویر نوٹوں کی پرواہ کیے بغیر
حکم کی تعمیل کر رہا ہے
یہاں ٹھہرنا ہے
نہ رُکنا ہے

عالمی دھارے

دنیا کی ہوا
کبھی دھول، کبھی آگ کے ساتھ چلتی ہے
ہر شہر، ہر گلی
خوف اور بے یقینی کی گونج سے بھری ہوئی ہے
لوگ بھاگتے ہیں، چھپتے ہیں
اور کچھ کھو جاتے ہیں
ہر آنکھ میں سوال، ہر ہاتھ میں تھکن
اور زبانیں خاموش، لیکن دل شور مچاتے ہیں

زمین کے گوشے
پانی، آگ اور دھوپ کے سنگ
ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہیں
کچھ فصلیں جل رہی ہیں
کچھ بستیوں کے کونے خالی پڑے ہیں
ہم دیکھتے ہیں
کہ سب کچھ اتنا نازک اور توڑنے والا ہے
ہر لمحہ ایک نئی حقیقت سامنے آتی ہے
اور انسان کو اپنے فیصلوں پر غور کرنا پڑتا ہے
بحرانی سرسراہٹ
دنیا کے کونے کونے میں
ہوا کی سرسراہٹ کسی خوف سے بھری ہے
کبھی بارش کی بوندیں
زمین کی سسکیوں سے مل کر
ایک نیا شور پیدا کرتی ہیں

سڑکیں خالی اور گھروں کی کھڑکیاں بند
لوگ اپنے قدم چھپاتے ہیں
اور ہر آنکھ میں سوال رہ جاتا ہے
کہ کل کیا ہوگا
کیا زندگی دوبارہ پہلے جیسی ہوگی
یوں چھوٹے لمحے
ہمارے دلوں میں روشنی بھرتے ہیں

نعمان منظور

میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں

میں نوکری اور موت کے درمیان زندگی

بھرنا چاہتا ہوں

میں پیڑوں سے..... پرندوں کی

پرندوں سے.....آسمانوں کی

آسمانوں سے..... پہاڑوں کی

پہاڑوں سے..... گہرائیوں کی

باتیں کرنا چاہتا ہوں

میں دریاؤں سے.....صحرا کی

صحرا سے.....سمندر کی

سمندر سے.....سیپیوں کی

سیپیوں سے.....محبت کی

اور محبت سے صرف تمھاری بات کرنا چاہتا ہوں

میں نوکری اور موت کے درمیان

زندگی بھرنا چاہتا ہوں

میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں

اعجاز رضوی

نان و نمک

ابریشم
سلمان باسط

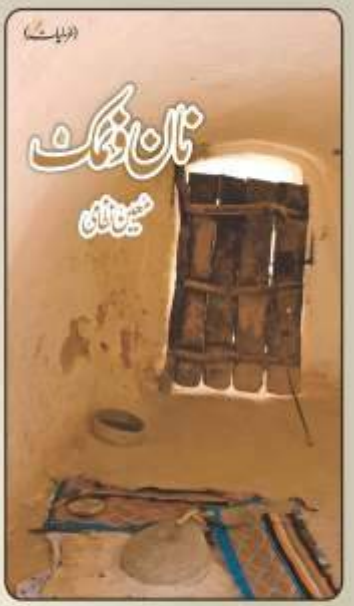

بشیرا
تم تو واقف ہو
ڈاکٹر عزیز فیصل

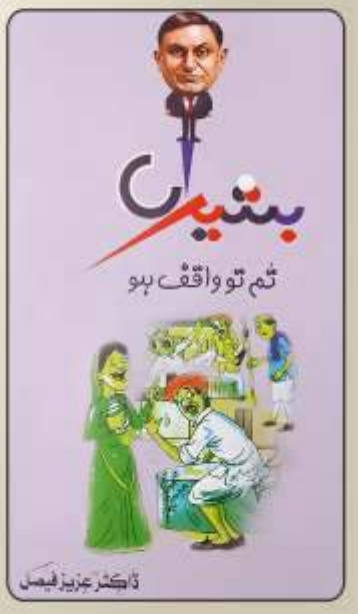

وِرلاپ
سلیم شہزاد

ہتھیلیوں پہ چراغ
تشبیب
خالد احمد
ایک مٹھی ہوا
خالد احمد
پہلی صدا پرندے کی
خالد احمد
جدید تر پاکستانی ادب
خالد احمد
نم گرفتہ
دراز پلکوں کے سائے سائے
خالد احمد
خالد احمد